تعلیماتِ اسلام

(ہدایاتِ زندگی کا مختصر نصاب)

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

اہتمامِ اشاعت: اِدارہ منہاج القرآن جاپان

تعلیماتِ اسلام

(ہدایاتِ زندگی کا مختصر نصاب)

منتخب دروس

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

مرتبہ

ضیاء نیر

منہاج القرآن پبلی کیشنز

365۔ ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور

فون:5169111-3,5168514 فیکس:5168184

URL:www.minhaj.org E-mail: tehreek@minhaj.org

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	**تعلیماتِ اِسلام** (ہدایاتِ زندگی کا مختصر نصاب)
منتخب دروس	:	**ڈاکٹر محمد طاہر القادری**
ترتیب و تحقیق	:	ضیاء نیر
نظرِ ثانی	:	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، شبیر احمد جامی (منہاجین)
تخریج و پروف ریڈنگ	:	اللہ بخش نیر (منہاجین)
کمپوزِنگ	:	محمد یامین (منہاجین)، حامد سمیع، عبدالخالق، بصیر احمد
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّتؒ ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ **www.Research.com.pk**
مالی معاونت	:	تحریک منہاج القرآن (جاپان)
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعتِ اَوّل	:	دسمبر **2001**ء
تعداد	:	**1,100**
قیمت	:	روپے

❁❁❁

نوٹ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو / ویڈیو کیسٹس اور **CDs** سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلیکیشنز)

sales@minhaj.biz

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۞	پیش لفظ	13
۞	**ا۔ ایمانیات**	
1	اسلام کا تصورِ دین	17
2	دین ہر شعبۂ زندگی پر محیط ہے	20
3	ایمان کے تین آداب	23
4	ایمان کے تین درجے	26
5	حدیثِ جبریل	29
6	ایمان، اسلام اور احسان	32
7	لفظ اسلام کے لغوی معانی	35
8	اسلام کا اصطلاحی مفہوم	37
9	اسلام کے مفہوم کا مثبت پہلو	40
10	ایمان باللہ کا مفہوم اور اس کے تقاضے (۱)	43
11	ایمان باللہ کا مفہوم اور اس کے تقاضے (۲)	46
12	تعلق باللہ اور اس کی اہمیت (۱)	49
13	تعلق باللہ اور اس کی اہمیت (۲)	53
14	تعلق باللہ اور اس کی اہمیت (۳)	57

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
15	ایمان بالرسالت	61
16	ایمان بالرسالت کے تقاضے	64
17	ایمان بالآخرت اور قرآن حکیم (۱)	66
18	ایمان بالآخرت اور قرآن حکیم (۲)	71
19	ایمان بالآخرت اور قرآن حکیم (۳)	74
20	ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت (۱)	78
21	ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت (۲)	81
22	ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت (۳)	84
23	ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت (۴)	88
24	ایمان بالقدر (۱)	91
25	ایمان بالقدر (۲)	94
26	قضاوقدر (تقدیر) اور انسانی زندگی (۱)	97
27	قضاوقدر (تقدیر) اور انسانی زندگی (۲)	100
28	قضاوقدر (تقدیر) اور انسانی زندگی (۳)	103
29	ملائکہ (فرشتوں) پر ایمان	106
30	تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان ضروری ہے	109
31	ایمان اور استقامت	113

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
32	استقامت کی جانچ اور پرکھ کے پانچ قرآنی اصول	116
33	استقامتِ ایمان پر ایک حکایت	119
34	ختمِ نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی (۱)	122
35	ختمِ نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی (۲)	126
۞	**ب۔ عقائد**	
36	حقیقتِ شرک	129
37	توسل کا بنیادی تصور (۱)	133
38	توسل کا بنیادی تصور (۲)	136
39	عقیدۂ توسل اکابرینِ امت کی نظر میں (۱)	139
40	عقیدۂ توسل اکابرینِ امت کی نظر میں (۲)	143
41	حضور ﷺ کے وسیلے سے مغفرت	146
42	نبوت اور علمِ غیب کا تعلق	149
43	حضور ﷺ کا علمِ غیب قرآن کی نظر میں	152
44	علمِ مصطفیٰ ﷺ بحث و تکرار کا موضوع کیوں؟	155
45	تصورِ بدعت اور اس کی شرعی حیثیت	158
46	شفاعت پر جمہور مسلمانوں کا عقیدہ	162
47	شفاعتِ کبریٰ حضور ﷺ کا خاصہ ہے	166

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
170	حضور ﷺ کی شفاعتِ عظمیٰ کا بیان	48
173	اولیائے وصالحین کا شفاعت فرمانا	49
	ج۔ عبادات	۞
176	اطاعتِ الٰہی اور اسلام کا تصورِ عبادت (۱)	50
179	اطاعتِ الٰہی اور اسلام کا تصورِ عبادت (۲)	51
182	نماز کی فرضیت واہمیت	52
186	نماز کے نظامِ اجتماعیت میں مسجد کی حیثیت	53
189	فرضیتِ رمضان اور اس کی اہمیت	54
192	روزہ اور معمولِ ختم قرآن	55
195	حج اور مناسکِ حج کی حقیقت	56
199	حج حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی یادگاریں (۱)	57
202	حج حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی یادگاریں (۲)	58
205	زکوٰۃ کی فرضیت واہمیت	59
208	انفاق فی المال کی حقیقت	60
212	جہاد بالمال کا قرآنی تصور	61
215	جہاد کے بارے میں قرآن کا عملی تصور (۱)	62
218	جہاد کے بارے میں قرآن کا عملی تصور (۲)	63

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
❁	**د۔ اخلاق و تصوف**	
64	خوفِ الٰہی اور اہل اللہ کے معمولات (۱)	221
65	خوفِ الٰہی اور اہل اللہ کے معمولات (۲)	224
66	اخلاقِ حسنہ اور عالمی انسانی معاشرہ	227
67	اسلامی معاشرہ میں تصوف کی ضرورت و اہمیت (۱)	231
68	اسلامی معاشرہ میں تصوف کی ضرورت و اہمیت (۲)	234
69	تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم	237
70	مومن کون ہے؟	240
71	سورۂ فاتحہ اور حیاتِ انسانی کا عملی پہلو	244
72	سورۂ فاتحہ اور تصورِ ہدایت (۱)	247
73	سورہ فاتحہ اور تصورِ ہدایت (۲)	250
74	مومن کے اوصاف	253
75	مومن کے ایمان کی کسوٹی	257
76	نیکی اور تقویٰ کا قرآنی تصور	261
77	فسادِ قلب (دل کا بگاڑ) کے علاج کا قرآنی منہاج (۱)	265

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
78	فسادِ قلب (دل کا بگاڑ) کے علاج کا قرآنی منہاج (۲)	268
79	فسادِ قلب (دل کا بگاڑ) کے علاج کا قرآنی منہاج (۳)	271
۞	**ر۔ سیرت و فضائل نبوی ﷺ**	
80	مطالعۂ سیرت کی ضرورت واہمیت	274
81	معارفِ اسم محمد ﷺ (۱)	277
82	معارفِ اسم محمد ﷺ (۲)	280
83	اسم محمد ﷺ خدا کی وحدانیت کی دلیل	283
84	قرآن اور شمائلِ نبوی (۱)	286
85	قرآن اور شمائلِ نبوی (۲)	289
86	ذاتِ مصطفےٰ ﷺ تمام کمالاتِ انبیاء کی جامع	293
87	حضور ﷺ اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہیں	297
88	جشنِ میلاد کی شرعی حیثیت	300
89	درودوسلام کی فضیلت	304
90	عشقِ مصطفےٰ ﷺ کی حقیقت (۱)	307
91	عشقِ مصطفےٰ ﷺ کی حقیقت (۲)	310
92	حیاتِ نبوی ﷺ کا معاشرتی پہلو	314

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
317	حیاتِ نبوی کا سیاسی پہلو	93
321	معجزۂ معراجِ مصطفےٰ ﷺ (۱)	94
324	معجزۂ معراجِ مصطفےٰ ﷺ (۲)	95
327	معجزۂ معراجِ مصطفےٰ ﷺ (۳)	96
	س۔ اسلامی افکار	۞
330	اتحادِ امت وقت کی اہم ترین ضرورت	97
334	نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی راہ میں حائل رکاوٹیں	98
337	سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۱)	99
340	سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۲)	100
343	معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	101
346	قرآنی فلسفہ انقلاب اور دعوت (۱)	102
350	قرآنی فلسفہ انقلاب اور دعوت (۲)	103
353	فرقہ پرستی کا مسئلہ اور اس کا حل	104

پیش لفظ

تحریکِ منہاج القرآن کی اٹھان سے ابتک کافی پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے لیکن اس کی مقبولیت میں دو عشروں سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود نہ صرف یہ کہ کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اس کی پذیرائی ملکی سرحدوں کو پھلانگ کر بیرونی دنیا کے تقریباً اسی ممالک میں۔

مشک آں است که خود ببوید نه که عطار بگوید

کے مصداق ایک منہ بولتا حوالہ بن کر اپنی خود پہچان بن چکی ہے۔اس کا بنیادی سبب بانیِ تحریک ڈاکٹر محمد طاہر القادری جیسے دانائے راز کی وہ فکری و عملی کاوشیں ہیں جو آپ قائدِ انقلاب کی صورت میں مختلف محاذوں پر سرانجام دے رہے ہیں۔آپ کے سامنے چار دانگِ عالم میں غلبۂ دین حق کی بحالی اور ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کا عظیم مشن ہے جس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے آپ نے اپنی زندگی کے شب و روز وقف کر رکھے ہیں۔ اس انقلابی جدوجہد جسے آپ ''مصطفوی انقلاب'' سے تعبیر کرتے ہیں کا جواز دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ ''ہم یہ تبدیلی نبوی انقلاب کے اتباع میں لانا چاہتے ہیں اور یہ انقلاب نہ تو کوئی فوجی نوعیت کا ہوگا اور نہ ہی کسی خون خرابہ اور تخریب کاری پر منتج ہوگا بلکہ اسے مصطفوی انقلاب کہہ کر ہم نے اس کے خدوخال اور اس کی سمت متعین کر دی ہے اور اس کا دائرہ کار بھی واضح کر دیا ہے۔''

آپ نے اپنی دعوت کو صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ مشرق سے مغرب تک اسے قابلِ قبول بنانا آپ کا نصب العین ہے اور وہ نصب العین ہے اسلامی

دولتِ مشترکہ (Islamic Common Wealth) کا قیام، اس عظیم مقصد کا حصول ملتِ اسلامیہ کے وقار و دبدبہ اور غلبۂ دینِ حق کی بحالی کی منزل سر کئے بغیر ممکن نہیں، اس کے لئے سازگار حالات ان تھک انقلابی جدوجہد کے ذریعے ہی پیدا کئے جاسکتے ہیں جس کی سمت قائدِ انقلاب پورے جوش و جذبہ اور عزم و ہمت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو لے کر گامزن ہیں۔ اس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ امتِ مسلمہ ایک بار پھر بقول اقبال دنیا کی امامت کا فریضہ سنبھالنے کی اہل ہوسکے۔

آپ فرسودہ سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی قدروں کی بجائے جو دین کے ادھورے تصور سے عبارت تھیں اسلام کے آفاقی ہمہ گیر اقدار کو فروغ دے کر دین کو ایک ایسی وحدت کے طور پر پیش کر رہے ہیں جس میں دین اور دنیا کی تفریق کا کوئی تصور نہیں۔ چنانچہ آپ نے ملک کے سیاسی نظام کو بدلنے کے لئے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا اور اس کے لئے پاکستان عوامی تحریک کی بنیاد رکھی۔ قائدِ تحریک نے دین کا جو تصور پیش کیا وہ ایک جامع اور عصرِ حاضر کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے والا دین ہے۔ اس کے مکمل خدوخال انہوں نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''قرآنی فلسفہ انقلاب'' میں اجاگر کردیئے ہیں۔

یہ تازہ کتاب جو ''تعلیماتِ اسلام'' کے نام سے ادارہ منہاج القرآن جاپان کی خواہش کی تعمیل میں شائع کی جارہی ہے۔ قبلہ قائدِ انقلاب کی مختلف موضوعات پر موجود کتب سے اخذ کردہ منتخب مواد پر مشتمل ہے، جسے ایک سو چار (104) سلسلہ وار ہفت روزہ دروس کی صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنی افادیت کے اعتبار سے کم تعلیمی استعداد رکھنے والے وابستگان تحریک کے لئے نہ صرف جاپان بلکہ اندرونِ ملک اور بیرون ملک اس بناء پر اس خصوصی اہمیت کی حامل ہوگی کہ اس کے ذریعے قاری تک زیادہ مؤثر انداز سے اسلام کے بنیادی امور سے متعلق قائد کی انقلابی فکر اور پیغام کو پہنچایا جاسکے گا۔

کتاب کو ترتیب دیتے وقت یہ شعوری کوشش کی گئی ہے کہ اس کی زبانِ سہل اور عام فہم ہو اور اس میں مختصر دورانیے کے ایسے اسباق پیش کئے جائیں جو ایمانیات، بنیادی عقائد، عبادات، اخلاق و تصوف، سیرت نبوی ﷺ اور اسلامی افکار کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچانے میں ممدومعاون ہوسکیں۔

قبلہ قائدِ انقلاب کی زیرِ ہدایت اس کتاب کے مندرجات پر محترم مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی صاحب اور محترم شبیر احمد جامی (منہاجین) نے نظرِ ثانی فرمائی ہے۔ ہم IQM جاپان کے تہ دل سے ممنون ہیں جن کی تحریک اور عملی معاونت سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو وہ حضرات کریں گے جن تک یہ تالیف پہنچائی جا رہی ہے۔ ہمیں اس کتاب کے مندرجات کو مزید بہتر بنانے کے لئے ان کی آراء اور تجاویز کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ضیاء نیر
ریسرچ سکالر
فریدِ ملت ؒ ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ

1 اسلام کا تصورِ دین

دنیا میں اس وقت جتنے نظام اور فلسفہ ہائے زندگی موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اسے دین کہا جا سکے کیونکہ دین فقط اس نظام کو کہا جا سکتا ہے جو ہر اعتبار سے کامل اور مکمل ہو اور وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کی ضروریات کو پورا کر سکے اور اس میں انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں رہنمائی کا سامان موجود ہو۔ دین کہلانے کے لائق وہی نظام ہے جو بیک وقت دنیا اور آخرت پر محیط ہو اور وہ ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہو۔ وہ نظام جس میں یہ شان نہ پائی جائے اسے آپ مذہب، فلسفہ، نظریہ اور تھیوری تو قرار دے سکتے ہیں مگر اسے دین نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ دین خالقِ کائنات کے نزدیک فقط اسلام اور صرف اسلام ہی ہے اور یہی نظام اس قابل ہے کہ اسے دین کا نام دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام　　بیشک اللہ کے نزدیک فقط اسلام ہی ہے۔

(آل عمران، ۳:۱۹)

یہ آیت آپ نے بارہا پڑھی اور سنی ہوگی۔ اس حوالے سے جو تصور ابھرتا ہے وہ اسلام کے ایک کامل اور مکمل دین ہونے کا ہے۔

قرآن مجید نے دین کے لفظ کو آخرت کے لئے بھی استعمال کیا ہے اور دنیوی نظام کے لئے بھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ دین، دنیا اور آخرت دونوں نظاموں پر

حاوی ہے۔ یہ ایک گمراہ کن تصور ہے کہ دین کا تعلق صرف آخرت سنوارنے سے ہے دنیا سنوارنے سے نہیں۔ یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہئے۔ یہ دو الگ چیزیں نہیں، دین کے دو حصے ہیں، ایک کا نام دنیا ہے اور دوسرے کا نام آخرت ہے۔ دین کل ہے اور دنیا و آخرت اس کے دو اجزاء ہیں اس لئے ''دین اور دنیا'' کہنا بجائے خود ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ لہٰذا جس شخص نے دین کو فقط دنیا پر حاوی قرار دیا اس نے دین کے ایک بازو کو کاٹ کر الگ رکھ دیا اور جس نے دین کو فقط آخرت سمجھا اس نے بھی دین کے ایک بازو کو جدا کر دیا۔

حضور ﷺ نے ہمیں دین کا جو تصور عطا کیا ہے اس کی رو سے جہاں مسجد کے اندر کی زندگی دین ہے وہیں مسجد سے باہر کی زندگی بھی دین ہے۔ اگر ایک طرف نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ جیسے ارکان دین کا حصہ ہیں تو دوسری طرف ناپ تول‘ لین دین‘ تجارت‘ کاروبار‘ معاشیات اور سیاست سبھی دین کا حصہ ہیں، ان کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھا جا سکتا۔ جو شخص ایسی تفریق کرے گا اسے جاہل اور اسلام کے تصورِ دین سے بے بہرہ قرار دیا جائے گا۔

دین کا حقیقی تصور کیا ہے؟ اس کی وضاحت بخاری شریف کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جہاد کی نیت سے پالے گئے گھوڑے کی لید صاف کرنا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے'' یہ ہے دین کا وہ تصور جو ہمیں ہمارے آقا و مولا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دیا ہے اور ایک ہم ہیں کہ محض وعظ و نصیحت‘ نماز‘ روزہ اور اللہ اللہ کرنے کو دین قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں اور تمام دنیاوی معاملات‘ مشاغل اور معمولات کو دین کے دائرے سے خارج تصور کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ دین کا صحیح تصور ہرگز نہیں۔ اگر انسان رزقِ حلال کمانے کی نیت سے دیانتداری کے ساتھ محنت کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لمحہ عبادت ہے اور اس کا درجہ نفلی عبادت سے بڑھ کر ہے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو فرض نماز کے بعد مسجد میں نفلی عبادت میں مشغول دیکھتے تو پکڑ کر باہر نکال دیتے اور اسے تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے کہ اللہ نے تجھ پر مخلوق کے بھی کچھ حقوق عائد کئے ہیں اور تجھے عائلی، خانگی، سماجی اور معاشرتی کاروباری ذمہ داریاں بھی ادا کرنی ہیں۔ حقوق اللہ کی ادائیگی میں حقوق العباد سے فرار ہرگز ہرگز دین نہیں بلکہ رہبانیت ہے جس کی اسلام نے سختی سے مذمت کی ہے۔

قرآن نے جہاں نظامِ آخرت کو دین کہا ہے وہیں دنیاوی معاملات کو بھی دین قرار دیا ہے ہم نماز کے اندر سورۃ فاتحہ میں ''مالک یوم الدین'' کہہ کر اللہ کے یومِ آخرت کے نظامِ جزا و سزا کا مالک ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ حکومت و سلطنت کا دنیوی نظام بھی دین کے دائرے میں شامل ہے اور آخرت کا سارا نظام بھی دین ہی کا حصہ ہے۔ گویا دین دنیا و آخرت کے دونوں جہانوں پر یکساں طور پر حاوی ہے اور دونوں کی بہتری اور اصلاح کا تقاضا کرتا ہے۔

اس لئے اسلام کو دین قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کے مکمل ہونے کا اعلان ان لفظوں میں کیا ہے۔

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا (المائدہ:۵:۳)	آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام بطور دین منتخب کر لیا۔

2 دین ہر شعبۂ زندگی پر محیط ہے

زندگی کا کوئی بھی گوشہ اور رخ جس کا تعلق چاہے فرد سے ہو، اجتماعی، معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی زندگی سے ہو یا تجارت، لین، دین، امن، جنگ اور صلح کے معاملات سے، کسی حال میں اسلام کے دائرہ کار سے باہر نہیں۔ نجی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک پوری زندگی ایک اکائی ہے اور دین اس پر اس طرح حاوی ہے کہ اس کے کسی جزو کو کل سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ کوئی لمحہ زندگی کے شب و روز کا ایسا نہیں جس کا دین سے براہ راست تعلق نہ ہو۔ لیکن کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم مارکیٹ میں کاروبار کرتے وقت، شادی بیاہ اور دوسری دنیاوی رسموں کو ادا کرتے ہوئے اور مسجد سے باہر گزرنے والی پوری زندگی میں دین سے بے گانہ اور لاتعلق ہو جاتے ہیں اور ہمیں مطلق خیال نہیں آتا کہ شریعت میں اس کے بارے میں مفصل احکام موجود ہیں جن کا ہمیں ذرہ بھر پاس نہیں۔

اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کا مندرجہ ذیل ارشاد پیش نظر رہے۔ آپ نے فرمایا:

لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسکی خواہشات اس (شریعت) کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لے کر آیا ہوں۔
(شرح السنۃ، ۱: ۲۱۳، کتاب الایمان، رقم حدیث: ۱۰۴) (مشکوۃ المصابیح، ۳۰)	

اس حدیث مبارکہ کی رو سے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی ایمان کا دعوی نہیں کرسکتا جب تک وہ اپنی تمام خواہشات کوترک کرکے مکمل طور پر دین کو اختیار نہ کرلے۔ ہمیں بتایا کیا جارہا ہے کہ تمہارے اندر اس وقت تک ایمان پختہ اور راسخ ہو ہی نہیں سکتا جب تک تمہاری خواہشیں، تمہاری آرزوئیں، تمہارے ارادے اور تمہاری پوری کی پوری زندگی دین کے قالب میں نہ ڈھل جائے اب یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ ہم مسلمان کہلاتے ہیں اور ایماندار ہونے کے بڑے بڑے دعوے بھی کرتے ہیں لیکن دنیا بھر میں ذلیل ورسوا بھی ہو رہے ہیں۔کبھی ہم نے سوچا کہ کفر کے مقابلے میں ہمیں ہر محاذ پر شکست اور ہزیمت کا سامنا کیوں ہے؟ اگر ہم خود اپنا احتساب کریں اور اپنے اعمال پر تنقیدی نظر ڈالیں تو یہ حقیقت ہم پر منکشف ہو جائے گی کہ ہم اپنے کھوکھلے کردار اور بد باطنی کی وجہ سے عملاً اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑانے کا موجب بن رہے ہیں۔قول وفعل کے تضاد اور اسلامی تعلیم سے دوری کی بناء پر ہم عملی طور پر عالمِ کفر کی اعانت اور مدد کر رہے ہیں۔ عالم کفر کا تو خیر کام ہی اسلام دشمنی ہے۔لیکن منافقت اور تضاد پر مبنی اپنے اعمال کے باعث ہم اسلام کو کفر سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ایک قدم اسلام کی طرف بڑھتا ہے تو دوسرا کفر کی طرف ہے۔

ایمان ہمیں کھینچے ہے تو روکے ہے ہمیں کفر

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اعمال کا مسلسل محاسبہ کرتے رہیں اور صرف اسلام کا نام لینے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ قرآن وسنت کے اتباع میں وہ حقیقی ایماندارنہ زندگی بسر کریں جس کا مکمل نمونہ سیرتِ نبوی ﷺ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعہ کا حوالہ دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔سیدنا فاروق

اعظمؓ کے سامنے کسی شخص کا مقدمہ پیش کیا گیا، آپ نے عدالت میں موجود لوگوں سے اس مقدمے کے بارے میں گواہی طلب کی، ایک صحابیؓ نے کہا کہ میں اسکا گواہ ہوں۔ آپ نے پھر استفسار فرمایا کہ کوئی ہے جو یہ گواہی دے کہ اس کی شہادت قابلِ قبول ہے۔ ایک اور صحابیؓ اٹھا اور یوں گویا ہوا کہ حضرت میں اسے جانتا ہوں۔ آپ نے وضاحت طلب کی تو اس نے کہا کہ وہ مسجد میں پانچ وقت حاضر ہوتا ہے اور نماز کبھی قضا نہیں کرتا۔ اس لئے میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کی شہادت قبول کر لی جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس سے سوال کیا کہ کیا کبھی تمہیں اسکے پڑوس میں رہنے کا اتفاق ہوا؟ کبھی دنیاوی معاملات میں اس سے سابقہ پڑا؟ یا کبھی اس کے ساتھ اکٹھا سفر کرنے کا موقعہ ملا؟ اس نے ہر بات کا نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کی زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے جو اس کے مسجد میں جانے اور نماز روزے تک محدود ہے، تمہیں اس کی باقی زندگی کے بارے میں جو مسجد سے باہر گزرتی ہے کوئی خبر نہیں کہ وہ عملاً بھی مسلمان ہے یا نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کی پہچان صرف، نماز، روزہ اور ظاہری عبادات کے حوالے سے نہیں بلکہ اسکی پوری معاشرتی زندگی کے حوالے سے ہوتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے ایک مسلمان کی تعریف یوں بیان فرمائی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اگر کوئی مسلمانی کے اس معیار پر پورا نہیں ترتا تو اسے یہ جان لینا چاہیے کہ وہ برائے نام مسلمان ہے اور ابھی ایمان نے اس کے باطن میں سرایت نہیں کیا۔

3 ایمان کے تین آداب

آدابِ ایمان کو بڑی حکمت کے ساتھ قرآن حکیم نے یوں بیان کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ۔

اے ایمان والو! اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ۔ اور اس کتاب پر (ایمان لاؤ) جو اسنے اپنے رسول پر نازل فرمائی ہے۔ (النساء،۴:۱۳۶)

ایمان کے تین آداب کیا ہیں جن کو بجالانا ایک مومن کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے، ہم ان کا مختصر طور پر جائزہ کریں گے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ ایمان کیا ہے اور کیا نہیں؟

پہلا ادب

ایمان کا پہلا ادب یہ ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد زندگی کو ایک مکمل اکائی اور ایسا کل سمجھا جائے جس کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ ایمان کے زبانی اقرار اور دلی تصدیق کے بعد مومن کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے احوال پر اسلام کو اس طرح حاوی کرلے کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جس پر کفر کی پرچھائیاں پڑی رہیں۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا ایک حصہ ایمان اور دوسرا حصہ کفر سے عبارت ہو۔ یہ صورتحال ایمان اور کفر کا ملغوبہ ہوگی جسے قرآن کی زبان میں منافقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا ادب

ایمان کا دوسرا ادب اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم بھولے سے بھی ان چیزوں کے قریب نہ جائیں جن پر قرآن اور پیغمبرِ اسلام نے پابندی لگا دی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں شریعت نے واضح طور پر حرام قرار دیا ہے۔

تیسرا ادب

ایمان کا تیسرا ادب اس بات کا کھوج لگانا ہے، کہ وہ کون سا اسلام ہے جس کو پوری زندگی پر حاوی اور نافذ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ کیا وہ اسلام انسانی عمل اور فہم و تدبر کا وضع کردہ ہے جس کے معیار ذاتی پسند اور ناپسند کے تحت ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں؟

درحقیقت انسانی عقل اور فہم و بصیرت ناقص اور حد درجہ محدود ہے۔ لہذا وہ اسلام جس کا خاکہ کسی انسان نے بنایا ہو، ناقابل قبول ہے اور صرف وہی اسلام قبول کئے جانے کے لائق ہے جو پوری انسانیت کو مصطفےٰ ﷺ کی چوکھٹ سے ملا ہے۔ اس کی عملی شکل اور خدوخال نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سیرتِ پاک کے آئینے میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ پس ایمان کا حتمی اور دائمی معیار یہ ہوا کہ ہر وہ بات جو ہمیں حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سیرتِ پاک سے نظر آئے اسے بغیر حیل و حجت کے ایمان سمجھ کر تسلیم کر لیا جائے اور جو بات سنت سے ٹکراتی ہو اسے کفر جان کر رد کر دیا جائے۔ کفر و ایمان کے رد و قبول کے اس معیار کو عملی زندگی میں اپنا لینا ہی تیسرے ادبِ ایمان کی بنیادی شرط ہے۔

زندگی کو مکمل طور پر اسلام میں داخل کرنے کے بارے میں باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً	اے ایمان والو! پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

(البقرۃ،۲:۲۰۸)

اس آیۂ کریمہ میں مکمل اسلام میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔جس سے یہ مراد ہے کہ ایمان اور کفر کی جو حدود متعین کی گئی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے پوری زندگی میں ایمان یوں جاری وساری ہو کہ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے جس پر کفر اور منافقت کی چھاپ نمایاں ہو۔

وہ کیفیت جو اسلام اور کفر کے ملاپ سے پیدا ہو کھلی منافقت ہے اور یہ اسلام کے ساتھ مذاق کے مترادف ہے۔کفر اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں، ان کے درمیان رواداری اور مصالحت کا کوئی تصور خدا کو منظور نہیں کیونکہ یہ منافقت ہے جس کی مذمت قرآن وحدیث میں بڑے زوردار اور سخت الفاظ میں کی گئی ہے۔جس کی تشریح اقبال کے اس شعر سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

ہمیں ایمان کے آداب اور تقاضوں کو سمجھ کر اس کیفیت سے باہر آ جانا چاہئے جو بیک وقت ایمان اور کفر دونوں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

4 ایمان کے تین درجے

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی ایمان یقینِ کامل اور محبتِ کامل کے مجموعے کا نام ہے۔ مزید گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان جس کی بنیاد یقین ہے اس کے تین درجے ہیں:

۱۔علم ۲۔عرفان ۳۔ایقان

۱۔ ایمان کا پہلا درجہ اصطلاحاً ایمان بالغیب یا علم (جاننا) کہلاتا ہے اس کا ذکر قرآنِ کریم میں یوں آیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وہ لوگ جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں

(البقرہ، ۲:۳)

جو لوگ بن دیکھے ایمان لاتے ہیں، وہ ایمان محض اس بنا پر لاتے ہیں کہ ان تک یہ بات اس ہستی کے ذریعے پہنچی ہے جس نے حقیقت کو بے نقاب دیکھا ہے۔ لہٰذا ایمان کا اولین تقاضا یہ ہوا کہ بن دیکھے خدا کو صرف اور صرف اس بنا پر مان لیا جائے کہ مومن تک اس ہستی کا علم اس مخبرِ صادق کے واسطے سے پہنچا ہے جس نے خود خدا کی ذات والا صفات کا مشاہدہ کیا ہے۔ ایسے میں ایمان بالغیب سے انکار کی کسے مجال ہو سکتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات کو بغیر دیکھے، رسول کریم ﷺ کے کہے پر مان لینا ہی ایمان ہے لیکن اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ:

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جب تک ہم اپنی آنکھوں سے خدا کو نہ دیکھ

جَهْرَةً ۔ لیں۔آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(البقرہ،۲: ۵۵)

یہ ایک طرح سے ایمان بالغیب کا انکار تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کو مشاہدے کے تجربے سے گزارا گیا تو وہ نور کی ایک تجلی (یا حق کی ایک آواز) کو بھی برداشت نہ کر سکے اور کوہ طور پر خدا تعالیٰ کو دیکھنے کے ارادے سے جانے والے ستر کے ستر افراد موت کا شکار ہو گئے۔

۲۔ اس کے بعد ایمان کا دوسرا درجہ آتا ہے جسے ''عرفان'' کہا جاتا ہے، یعنی جس حقیقت کو بن دیکھے مانا جا رہا ہے، اس حقیقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنا اور اس کی بنیاد پر اس ہستی پر اپنا یقین پختہ کرنا۔ یقین کے اس درجے کا ذکر قرآن کریم میں یوں آتا ہے۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اور خود تمہارے نفوس میں (بہت سی نشانیاں ہیں) کیا تم نہیں دیکھتے۔

(الذاریات،۵۱: ۲۱)

اے خدا کے بندو، خدا تعالیٰ کی قدرت، اس کے بے اندازہ انعامات اور کمالات پر ایمان لانے والو! سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کر کے صحیح نتائج پر پہنچنا سب کچھ تمہارے اندر پوشیدہ ہے، خدا تعالیٰ کی قدرت کے تمام حقائق اور ان کی علامات تمہارے اپنے نفس میں موجود ہیں۔ ذرا اپنے اندر جھانک کر تو دیکھو۔ اپنی بشریت کے تاریک پردوں کو اٹھا کر حقیقت کو سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ پھر دیکھو، کس طرح یہ حقیقتیں تمہارے من سے جھلکتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ ہم ان کو عنقریب اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر

(حم السجدہ،۴۱: ۵۳)　　ہو جائے گا کہ وہی حق ہے۔

۳۔　ایقان ایمان کا تیسرا درجہ ہے جس کو واضح کرنے کے لئے قرآن نے متعدد واقعات پیش کئے گئے ہیں جن میں سے ایک حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی ہے، جب وہ ایک بستی کے قریب سے گزرے جو مدتوں سے اجڑ چکی تھی (اس بستی کے متعلق زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ بیت المقدس (یروشلم) کا شہر تھا۔ مگر قرآن مجید میں فقط کسی بستی کے نام سے اس کا ذکر کیا گیا ہے) اس اجڑی ہوئی بستی کو دیکھ کر ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ:

اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا۔　خدا اس کے باشندوں کو (یا خود اس بستی کو) مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا۔ (البقرہ،۲: ۲۵۹)

حضرت عزیر علیہ السلام (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کے احیاء موتی کی قدرت سے انکار نہیں کررہے تھے، بلکہ دراصل ان کے دل میں ویران شہر دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ بستیاں جو خاک میں مل چکی ہیں، کاش مجھے اپنی آنکھوں سے ان کا آباد اور زندہ ہونا دیکھایا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ان تمام مراحل سے گزار دیا جس کا ذکر۔ قرآن حکیم کی اس آیۂ کریمہ میں کیا گیا۔

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ ؕ قَالَ بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَةَ عَامٍ۔　خدا نے ان کی روح قبض کر لی اور سو برس تک حالتِ موت میں رکھا۔ پھر ان کو جلا اٹھایا اور پوچھا کتنا عرصہ ٹھہرے ہو انہوں نے جواب دیا، ایک دن یا اس سے بھی کم فرمایا نہیں بلکہ سو برس تک ٹھہرے رہے ہو۔ (البقرہ،۲: ۲۵۹)

5 حدیثِ جبریل علیہ السلام

اسلام اور ایمان میں اصطلاحی فرق کو سمجھنے کے لئے حدیثِ جبریل کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ حدیثِ جبریل ذخیرۂ حدیث کی مشہور ترین روایت ہے جسے قریب قریب تمام محدثین نے نقل کیا اور اس کے راوی خلیفہ دوم سیدنا فاروق اعظمؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے تو ایک ایسا شخص آیا جس کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مگر اس پر سفر کا بھی کوئی نشان نہ تھا۔ اس کے بال بہت کالے اور کپڑے دودھ کی طرح سفید تھے۔ وہ حضور کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور آپ سے سوال کرنے لگا:

یا محمد اخبرنی عن الاسلام قال الاسلام ان تشهد ان لا اله الا الله و ان محمدأ رسول الله و تقیم الصلوة و توتی الزکوة و تصوم رمضان و تحج البیت ان استطعت الیه سبیلا قال فعجبنا له یسأله و یصدقه قال فاخبرنی عن الایمان قال ان تؤمن بالله و ملئکته وکتبه و رسله والیوم

اے محمد ﷺ! مجھے اسلام کی بابت بتایئے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرے، زکوۃ ادا کرے، رمضان المبارک کے روزے رکھے اللہ طاقت و وسعت دے تو بیت اللہ کا حج بھی کرے۔ اس پر اس اجنبی شخص نے کہا کہ آپ نے سچ فرمایا ہے۔ ہمیں تعجب

الاخر و تؤمن بالقدر خيره و شره قال صدقت قال فاخبرنی عن لاحسان قال ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك قال فاخبرنی عن الساعة قال ما المسئول عنها باعلم من السائل قال فاخبرنی عن اماراتها قال ان تلد الامة ربتها و ان ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشآء يتطاولون فی البنيان قال ثم الطلق فلبثت مليا ثم قال لی يا عمرؓ اتدری من السائل قلت الله و رسوله اعلم قال فانه جبريل اتاكم يعلمكم دينكم.

(صحیح مسلم، ۱:۲۷، کتاب الایمان، رقم حدیث:۱)

(صحیح البخاری، ۱:۱۲، کتاب الایمان، رقم حدیث:۵۰)

ہوا کہ خود سوال بھی پوچھتا ہے اور پھر تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس نے کہا: مجھے ایمان کے متعلق کچھ بتائیے۔ آپ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ اور اسکے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور یومِ آخرت کو حق جانو اور ہر خیر و شر کی تقدیر پر ایمان رکھو، یہ سن کر اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے سچ فرمایا اس کے بعد اس نے عرض کیا۔ مجھے بتلائیے کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت و بندگی تم اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھتا ہے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ شخص چلا گیا، تھوڑی دیر بعد حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا۔ اے عمرؓ کیا تمہیں علم ہے کہ وہ سوال کرنے والا کون تھا میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں، آپ نے فرمایا وہ جبریل تھے، تمہاری اس مجلس میں اس لئے آئے

تھے کہ تم لوگوں کو تمہارا دین سکھائیں۔

اس حدیث سے یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ دین کی تین بنیادی ضرورتیں ہیں:
پہلی ضرورت ایمان ہے، جس کا تعلق بنیادی طور پر انسان کے عقائد سے ہے، دوسری ضرورت اسلام ہے، جو بنیای طور پر انسان کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے، تیسری ضرورت احسان ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن جب یکساں ہو جاتے ہیں اور اس کے عقائد و اعمال کے روحانی اثرات اس کے باطن کو منور کرنے لگتے ہیں تو اسے ایسی کیفیت نصیب ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے سے دنیا کے مادی پردے اٹھا لئے جاتے ہیں، اور بندہ کو نورِ مطلق اور اس کی تجلیات کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے یا یوں کہیے کہ ذات حق اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کے حال پر لطف و مہربانی کی وہ نگاہ ڈالتی ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی ہر خواہش و آرزو سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس سے ایک یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نہ تنہا ارکان اسلام کی پابندی سے کوئی شخص مسلمان ہو سکتا ہے، اور نہ محض عقائد کی اصلاح سے کوئی شخص اپنی منزل کو پا سکتا ہے۔ اگر اسلام اور ایمان دونوں کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے، جیسا کہ کرنے کا حق ہے، تبھی انسان صحیح مسلمان اور مومن کہلانے کا حق دار ہوتا ہے۔ جب ایمان و اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے میں اخلاص اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو اس منزل کو ''احسان'' کہتے ہیں۔

6 ایمان، اسلام اور احسان

ایمان کا موضوع عقائد ہیں اور اسلام کا موضوع مسلمانوں کے اعمال و افعال ہیں، جن کے علم کو اصطلاحاً ''علم الفقہ'' کہتے ہیں۔ اسی طرح احسان کا موضوع ایمان کی باطنی و روحانی کیفیات کا حصول ہے، اس سے بحث کرنے والے علم کو ''علم الطریقت'' یا ''علم التصوف'' کہا جاتا ہے۔ یہ سب علوم ایک ہی سرچشمہ اور ایک ہی مرکز و محور سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہے، چنانچہ ایمان کے بغیر اسلام نا تمام ہے اور بغیر اسلام ایمان کی تکمیل ناممکن ہے، جب کہ احسان کے بغیر ایمان اور اسلام دونوں ناقص رہ جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کوئی شخص نہ اسلام کی محض ظاہری تعلیمات پر عمل کر کے بحیثیت مومن درجۂ کمال کو پہنچ سکتا ہے اور نہ محض باطنی اور روحانی لذات کا طالب بن کر۔ حق تو یہ ہے کہ ایک طرف ایمان کے تقاضے پورے ہوتے رہیں اور دوسری طرف اسلام کے بنیادی اصولوں پر بھی عمل میں سستی اور کوتاہی واقع نہ ہونے پائے بلکہ ایمان و اسلام کی دونوں قوتوں کے ساتھ روحانی کمال کی منزل ''احسان'' کو حاصل کیا جائے۔

امام مالک علیہ الرحمۃ ان دونوں راستوں کو یکجا کرنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

من تفقه و لم يتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهما	جس شخص نے فقہ یعنی محض ظاہر اسلام کو تھام لیا اور تصوف و روحانیت کو چھوڑ دیا وہ بلاشبہ فاسق و فاجر ہوا۔ اور جس نے

فقد تحقق.

ا۔مرقاۃ المصابیح،۱:۳۱۳۔

فقہ کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیا، مگر طریقت وتصوف کو اپنائے رکھا، ایسا شخص بھی بلاشبہ زندیق ہوا۔ حق اور کمالِ مطلوب کو وہی پہنچ سکتا ہے جس نے دونوں کو جمع کیا (یعنی اس کے ایک ہاتھ میں راہ شریعت کا چراغ ہو اور دوسرے میں طریقت و روحانیت کا۔ وہ ظاہر شریعت یعنی فقہ سے ظاہری دنیا میں اور باطنِ شریعت یعنی طریقت سے باطنی دنیا میں اجالا کر رہا ہو۔)

اسی تصور کو شیخ ابوطالب مکیؒ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

هما علمان اصليان لا يستغنى احدهما عن الاخر بمنزلة الاسلام والايمان مر تبط كل منها بالاخر كا لجسم والقلب لا ينفك احد من صاحبه

ا۔مرقاۃ المصابیح،۱:۳۱۳۔

(شریعت وطریقت یعنی فقہ اور تصوف) دو حقیقی علم ہیں ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتا انکی مثال اسلام اور ایمان کے باہمی تعلق کی ہے جیسے وہ ایک دوسرے سے جسم اور دل کے تعلق کی طرح مربوط ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوسکتا۔

ایمان، اسلام اور احسان ہی دین حق کے اجزاء ہیں اور انہی کے یکجا جمع ہونے

سے اسلامی تعلیمات مکمل ہوتی ہیں۔

''اسلام'' کا مادہ اشتقاق س، ل، م ''سلم'' ہے۔ اس کے لغوی معنی بچنے، محفوظ رہنے، مصالحت اور امن وسلامتی پانے کے ہیں۔ حدیث شریف میں اس لغوی معنی کے لحاظ سے ارشاد ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده

مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے دوسرے مسلمانوں (کے مال اور عزتیں) محفوظ ہیں۔

۱۔ صحیح البخاری، ۱:۶، کتاب الایمان، رقم حدیث: ۱۰۔۱۱

لفظ اسلام کے لغت میں چار مفہوم ہیں:

۱۔ پہلا مفہوم خود امن وسکون پانا اور دوسروں کو امن وسلامتی مہیا کرنا۔

۲۔ دوسرا مفہوم ماننا، جھکنا، خودسپردگی اور اطاعت اختیار کرنا۔

۳۔ اسلام کا تیسرا مفہوم صلح اور آشتی کا پایا جانا۔ صلح کے لئے سَلْمٌ یا سِلْمٌ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ لفظ اسلام میں پائے جانے والے چوتھے مفہوم پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ عربی میں اونچے درخت کو ''سلام'' کہا جاتا ہے اور سیڑھی کو سُلّم کہتے ہیں۔ درخت اور سیڑھی اپنی اونچائی کی وجہ سے لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے اسلام کے لفظ میں بلندی اور عظمت کا مفہوم شامل ہے۔ ظاہر ہے اسلام سے زیادہ عظمت کسی اور مذہب کے حصے میں نہیں آئی۔

7 لفظ اسلام کے لغوی معانی

پہلا معنی: لغت کے اعتبار سے لفظ اسلام چار معنوں پر مشتمل ہے۔ اسلام کا پہلا لغوی معنی خود امن وسکون پانا، دوسرے افراد کو امن وسلامتی دینا اور کسی چیز کی حفاظت کرنا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام کا معنی لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ گویا اس کے مفہوم میں خود امن مہیا کرنا بھی شامل ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ

(المائدہ، ۱۶:۵)

اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے ایسے لوگوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں۔

دوسرا معنی: اسلام کا دوسرا مفہوم ماننا، تسلیم کرنا، جھکنا اور خود سپردگی و اطاعت اختیار کرنا ہے۔ اس معنی میں لفظ اسلام قرآن وحدیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ سورہ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَO

(البقرہ، ۱۳۱:۲)

جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا: اطاعت اختیار کرو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے جہانوں کے رب کی اطاعت اختیار کی۔

نیز فرمایا:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ۔

(النساء، ۱۲۵:۴)

اور اس سے اچھا دین کس کا ہوگا جو اپنا چہرہ اپنے رب کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو۔

اس تصور کے تحت اسلام کا معنی یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کردے اور اس میں یہ عزم پایا جائے کہ بیشک جان چلی جائے، لیکن زبان یا دل پر حرفِ انکار نہ آنے پائے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

تیسرا معنی: لفظ اسلام کا تیسرا مفہوم صلح و آشتی کا پایا جانا ہے صلح کے لئے **سَلْمٌ یا سِلْمٌ** کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْآ اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ (محمد، ۴۷:۳۵)

تم ہمت نہ ہارو (ثابت قدم رہو) اور باطل کو صلح کو طرف مت بلاؤ پھر تم ہی غالب رہو گے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً۔ (البقرۃ، ۲:۲۰۸)

اے اہلِ ایمان: پورے کے پورے اسلام (یعنی سلامتی) میں داخل ہو جاؤ۔

چوتھا معنی: جیسا کہ سابقہ درس میں ذکر ہوا اسلام کے لفظ میں پائے جانے والے چوتھے مفہوم کی طرف اہلِ علم نے بہت کم توجہ کی ہے، بلند و بالا درخت کو عربی زبان میں ''سلام'' کہا جاتا ہے اور سیڑھی کو سُلَّم کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ درخت اور سیڑھی اپنی اونچائی کی وجہ سے لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس مادۂ اشتقاق کی رو سے 'اسلام' کے لفظ میں بلندی اور عظمت کا مفہوم شامل ہے۔ ظاہر ہے اسلام سے زیادہ دنیا میں عظمت و رفعت کسی اور مذہب کے حصہ میں نہیں آئی ہے اور یہ اس کی عظمت ہی کی دلیل ہے کہ یہ ہر ایک بدخواہ کی دسترس سے باہر ہے۔

8 اسلام کا اصطلاحی مفہوم

اسلام میں امن وسلامتی کا مفہوم دو لحاظ سے شامل ہے:

(الف) لازم (ب) متعدی

لفظِ اسلام اپنے معنی لازم کے اعتبار سے ''امن و عافیت کو پا لینے اور ہر قسم کے خوف و خطر سے محفوظ ہو جانے'' سے عبارت ہے۔ لہذا مسلم وہ شخص ہے جو اسلام کے باعث دنیا اور آخرت میں امن و عافیت پا لے اور ہر خوف وغم سے محفوظ ہو جائے۔ کیونکہ اسلام اپنے پیروکاروں کے مصائب و مشکلات سے حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اس لئے امن وعافیت کا یہ مفہوم دینِ اسلام کے تمام پہلوؤں اور علمی وعملی گوشوں میں پوری طرح جاری وساری ہے۔ اس لئے اسلام ہی حقیقت میں راہِ فلاح ونجات ہے۔

متعدی معنیٰ کے اعتبار سے اسلام دوسروں کو امن وسلامتی اور حفاظت و عافیت مہیا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مسلم وہ شخص ہے جو دوسروں کے لئے باعثِ امن و عافیت ہو، اس کے ذریعے دوسرے لوگوں کو سلامتی اور حفاظت کا احساس میسر آئے جیسا کہ حضور علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده.	مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمانوں کے جان و مال اور عزت وآبرو محفوظ ہوں۔
(صحیح البخاری، ۱:۶، کتاب الایمان، رقم حدیث: ۱۰-۱۱)	

الدین النصیحة قلنا لمن قال للہ ولکتابه و لرسوله ولا ئمة المسلمین وعامتهم.

دین وفاداری اور خیر خواہی کا نام ہے۔ (صحابہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ خیر خواہی اور وفاداری کس کے لئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ، اس کے رسول، اس کی کتاب، مسلمانوں کے حکام اور عوام کیلئے۔

ا۔صحیح مسلم ، ۱:۵۴، کتاب الایمان، رقم حدیث:۹۵

قرآنِ حکیم میں یہ امر واضح کیا گیا کہ جب تک دنیائے انسانیت کفر اور ظالمانہ تسلط کے خاتمے کے ذریعے امن و عافیت کا گہوارہ نہ بنی اس وقت تک ''دین کی تکمیل'' کا اعلان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ تکمیلِ اسلام کا اعلان دنیا کو امن و سلامتی مہیا کرنے کی ضمانت دیئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے ارشاد فرمایا گیا:

اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ ؕ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا۔

(المائدہ،۵:۳)

آج کے دن کافر تمہارے دین (کی تکمیل) سے مایوس ہو گئے، پس تم ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بطور ابدی دین کے منتخب کرلیا۔

اور اہل ایمان کی تعریف کرتے ہوئے بار بار یہ ارشاد فرمایا:

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ | پس نہ تو کوئی خوف ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

(البقرہ، ۲:۳۸)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی شان کا تذکرہ بھی ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ | یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ تو کوئی اندیشہ ہوتا ہے اور نہ غم والم۔

(یونس، ۱۰:۶۲)

اسی بنا پر جب اہلِ اسلام نے نبی اکرم ﷺ کی زیرِ قیادت مکہ معظّمہ کو فتح کیا، تو اس وقت آپ ﷺ نے کفار و مشرکین کو عام معافی کی نوید سناتے ہوئے اور انہیں جان کی امان اور پناہ دیتے ہوئے یہ اعلان فرمایا:

''جو کوئی اسلام قبول کرے گا یا بیت اللہ شریف میں داخل ہوگا یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا یا اپنے ہی گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھا رہے گا، وہ امن و عافیت میں ہو گا۔ (سنن ترمذی، وسنن نسائی، مشکوٰۃ المصابیح، ۱:۲۳' حدیث ۲۹)

ابوسفیان کے گھر کو ''خانۂ امن'' بنا دینے کا پس منظر یہ تھا کہ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا تھا اور یوں اس نے خود بھی امن و عافیت کی دولت پا لی تھی اور دوسروں کے لئے بھی اپنی ذات اور اپنے گھر کو دارالامان اور حفاظت کا مرکز بنا لیا تھا۔

9 اسلام کے مفہوم کا مثبت پہلو

اس کا مطلب ہے دوسروں پر زیادتی نہ کرنا، ان کے لئے کسی پریشانی اور مصیبت کا سبب نہ بننا گویا مسلمان وہ شخص ہے جو دوسروں کے لئے سراسر آسودگی، نفع بخشی، راحت اور امن و عافیت کا ذریعہ ثابت ہو۔ اس کا جینا، مرنا، اس کی سوچ، فکر، الغرض اس کی ہر چیز دوسروں کے لئے سکون واطمینان کا سبب ہو جائے۔ اسی بناء پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں مصروف ہوتا ہے، خدا تعالیٰ اسکی حاجت براری میں مصروف ہو جاتا ہے اور جو کوئی اپنے کسی مسلمان بھائی کی تنگی دور کرے، خدا تعالیٰ قیامت کی سختیوں میں سے ایک سختی اس سے دور کر دے گا اور جو کوئی مسلمان کے عیوب کی پردہ پوشی کرے گا، خدا تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

نیز فرمایا ''بخدا کوئی بندہ اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں، جب تک وہ دوسروں کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

آپ ﷺ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص کسی مسلمان بھائی کی غیر حاضری میں اس کے گوشت کی حفاظت کرتا ہے (دوسروں کو غیبت کرنے سے منع کرتا ہے)، تو خدا تعالیٰ اسے جہنم سے آزادی بخشتا ہے۔

ایک اور حدیث پاک میں ہے ''جو مسلمان بھی اپنے کسی مسلمان بھائی کی ایسے موقع پر مدد کرتا ہے جبکہ اس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچایا جا رہا ہو تو خدا تعالیٰ اس کی ان

گھڑیوں میں امداد فرماتا ہے جب اسے مدد کی ضرورت ہو۔(ابوداوٗد' مشکوٰۃ)

ان تمام ارشاداتِ نبوی سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام صلح و محبت کا دین ہے نہ کہ جبر اور جنگ کا۔

احادیث میں تو یہاں تک تاکید ملتی ہے کہ اگر کوئی کافر تلوار سر پر لٹکتی دیکھ کر بھی دعوتِ اسلام قبول کرے یعنی کلمۂ طیبہ پڑھ لے تو اس کے قتل سے ہاتھ روک لینا ضروری ہے۔ایک مرتبہ ایک صحابی اسلام کے دشمن کو قتل کرنے ہی والے تھے کہ اس نے کلمۂ طیبہ پڑھ لیا، مگر صحابی نے اس کے کلمہ کی پروانہ کی اور اسے قتل کر دیا، آنحضرت ﷺ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے سخت الفاظ میں اس قتل پر پوچھ گچھ کی اور اس صحابی رضی اللہ عنہ کے اس قول پر کہ اس نے محض جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔(ابوداوٗد) اور پھر اس مقتول کے ورثاء کو پوری دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔

واضح رہے کہ اسلام جس صلح کی تعلیم دیتا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ کبھی بھی حق اور باطل، سچ اور جھوٹ کا فرق ختم نہ ہونے پائے اور ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھا جائے۔لیکن ہمارے ہاں صلح کا تصور یہ ہے کہ برائی کو برائی سمجھتے اور باطل کو باطل جانتے ہوئے بھی اس کے ساتھ تعاون کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہم صلح پسند ہیں، اس لئے ہر شخص کو خوش رکھنا چاہتے ہیں، اور ہر شخص کی ناراضگی سے بچنا چاہتے ہیں۔ہمیں خوف آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟ جھوٹے کو جھوٹا اور سیاہ کار کو سیاہ کار اس لئے نہیں کہتے کہ اپنے اندر اس کی ناراضگی مول لینے کا حوصلہ نہیں پاتے۔حالانکہ ہم دعائے قنوت میں ہر شب خداتعالیٰ سے اس عہد کی تجدید کرتے ہیں:وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ ۔(اور ہم اس سے تعلق منقطع کر لیتے ہیں جو تیری نافرمانی کرے۔)

اور قرآن میں ارشاد ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْراً۔

(الحج،۲۲:۴۰)

اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں خدا کا بہت ذکر کیا جاتا ہے، ویران ہو چکی ہوتیں۔

مزید ارشاد فرمایا:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ، فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔

(البقرة،۲:۱۹۳)

اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فساد نابود نہ ہو جائے اور (ملک میں) خدا ہی کا دین ہو جائے اور اگر وہ (فساد سے) باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں (کرنی چاہیے)

اس آیتِ کریمہ میں قرآنِ حکیم دو اصول بیان کر رہا ہے: اگر کسی معاشرے میں ظلم وستم ڈھایا جا رہا ہو تو اس ظلم کو روکنے اور معاشرے میں امن و امان کی صورتِ حال پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ظلم کے خلاف (تادیبی و انسدادی) کارروائی عمل میں لائی جائے اور اگر معاشرہ ہر فتنے اور شر سے پاک وصاف ہو جائے تو خود بھی امن سے رہا جائے اور دوسروں کو بھی امن سے رہنے دیا جائے۔

10 ایمان باللہ کا مفہوم اور اس کے تقاضے (۱)

حدیثِ جبریل جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ اس میں حضور سرور کائنات ﷺ نے جن چیزوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا ان میں سے پہلی چیز اللہ پر ایمان ہے۔

ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے (اقرار باللسان و تصديق بالقلب) اس اعتبار سے ایمان باللہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے واحدۂ لاشریک، خالق و مالک ہونے، پروردگار اور حاجت روا ہونے کو زبان سے مانے اور دل کی گہرائیوں سے اس کی تصدیق بھی کرے۔ اس اقرار و تصدیق کو جمع کرنے کا نام ایمان باللہ ہے۔

اگر محض زبان سے ہی اللہ کے اللہ ہونے کا اقرار و اظہار کافی ہوتا تو ایمان کی یہ شرط ماننی کافروں کو اتنی مشکل نہ ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اقرار کے ساتھ ساتھ ایمان باللہ کے کچھ تقاضے اور بھی ہیں جن کو پورا کرنے سے ایمان کی تصدیق عملاً ہو جاتی ہے۔ اگر ان تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کیا جائے تو ایمان مکمل ہوتا ہے اور ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔

ایمان باللہ کے تقاضوں کو ہم بنیادی طور پر تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

O محبتِ الٰہی　　O اطاعتِ الٰہی　　O توکل علی اللہ

محبتِ الٰہی کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے۔

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْآ اَشَدُّ حُبًّالِلّٰہِ (البقرہ،۲:۱۶۵) اور اہل ایمان اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کی علامت یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے دلوں میں خدا کی ذات سے بے پناہ محبت اور دلی تعلق پیدا ہو جائے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن اللہ کے سوا کسی اور کی محبت اپنے دل میں نہیں سمو سکتا، کیونکہ جس دل میں خدا تعالیٰ کی محبت سما جاتی ہے، اس دل میں کسی اور کیلئے محبت والا تعلق پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ بیوی بچوں، بہن بھائیوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی محبتیں اس عظیم محبت کے تابع ہو جاتی ہیں۔ یہ محبت جس محبت کو باقی رکھنا چاہتی ہے، وہ باقی رہتی ہے اور جس کو ختم کرنا چاہتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہی حقیقی اور سچی محبت ہے (جس کو صوفیاء کرام عشقِ حقیقی کہتے ہیں) اور جس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَ مَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔
سنن ابوداؤد،۲:۲۹۵، کتاب السنہ، رقم حدیث:۴۶۸۱

جس نے اللہ کے لئے (دوسروں سے) محبت اور دشمنی رکھی، اور اللہ کے لئے کسی کو دیا یا نہ دیا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

اللہ سے محبت ہی دراصل وہ مرکز ہے جس کے گرد سب محبتیں ہاتھ باندھے کھڑی ہوتی ہیں۔ اگر یہ کیفیت پیدا کرلی جائے تو ایمان کامل ہوگا۔ اسی لئے قرآن حکیم میں سرورِ کائنات ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَ اذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًاط (المزمل، ۷۳:۸)

اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی کے ہو رہو۔

جب حضور ﷺ کی رب سے محبت اپنی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب آپ سب کو یہ سنا دیں۔

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَO

میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ خدائے رب العالمین کے لئے ہے۔

(الانعام،۶:۱۶۲)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ محض اوقات مقررہ پر مخصوص عبادات کرنے ہی سے حقِ بندگی اور حقِ محبت ادا نہیں ہوتا بلکہ حق تو یہ ہے کہ انسان زندگی اور موت کو مکمل طور پر اللہ کے تابع کر دے اور پھر یوں کہے کہ میرا جینا اور مرنا سب کچھ خدا رب العالمین کیلئے ہے۔

یہ محبت و بندگی کا سب سے اونچا مقام ہے کہ انسان کی نگاہ میں اپنی شخصیت اور اپنی ذات بھی ہیچ ہو جائے اور اس کے دل اور دماغ میں صرف ایک ہی ذات، ایک ہی شخصیت اور ایک ہی محبوب کی محبت و عقیدت باقی رہ جائے۔ اسی وجہ سے عارف لوگوں کا کہنا ہے کہ عشق ایسی آگ ہے جو دل سے محبوب کے سوا سب کچھ جلا دیتی ہے۔

11 ایمان باللہ کا مفہوم اور اس کے تقاضے (۲)

ایمان کی شرطوں میں پہلی شرط کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ: انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر بڑی کثرت سے کرتا ہے۔ قرآن مجید میں خدا کے بندوں کی شان میں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًاO	اور وہ جو اپنے پروردگار کے حضور (انتہائی عجز و نیاز سے) سجود و قیام میں راتیں بسر کر دیتے ہیں۔

(الفرقان، ۲۵:۶۴)

یہ تو محبت کا دعوی کرنے کے بعد اس کی پہلی شرط کو پورا کرنے والوں کا ذکر تھا اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو محبتِ خداوندی کا دعوی تو کرتے ہیں لیکن غفلت کی نیند سوئے رہتے ہیں۔ ان کی بابت سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص اپنے دعوائے محبت میں جھوٹا ہے، جو زبان سے محبت کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر رات کو خواب غفلت میں پڑا رہتا ہے۔

محبت خداوندی کی دوسری شرط یہ ہے کہ اگر انسان پر دنیا میں رہتے ہوئے کوئی آزمائش یا پریشانی آجائے تو وہ اس آزمائش کو مصیبت نہ سمجھے بلکہ اسے اپنے محبوب کی عطا جان کر نہ صرف اسے قبول کرے بلکہ اس دکھ اور پریشانی میں راحت اور لذت بھی محسوس کرے۔ قرآن کریم میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ متعدد بار بیان ہوا ہے کہ وہ انتہائی سخت جسمانی تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود کبھی شکایت کا لفظ زبان پر نہ لاتے تھے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ تقریباً بارہ سال وہ اس بیماری میں مبتلا رہے، ان کی بیوی انہیں یہ کہتیں کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ وہ آپ کی تکلیف دور کر دے۔ وہ جواب دیتے کہ زندگی بھر رب کی نعمتیں میرے شاملِ حال رہی ہیں، اب اگر اس کی طرف سے یہ تھوڑی سی تکلیف آ گئی ہے تو مجھے بے صبری کا اظہار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بارہ سال کے بعد اہلیہ نے زیادہ ہی مجبور کیا تو ہاتھ اٹھا کر فقط یہ فرمایا:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ط	(اے میرے پروردگر) مجھے اذیت ہو رہی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

(الانبیاء، ۲۱:۸۳)

ایمانِ باللہ کی تیسری شرط یہ ہے کہ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت سما جاتی ہے تو انسان کے دل کا ہر اس چیز سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے جو محبت الٰہی سے دوری کا سبب بنتی ہو۔ اسی بنا پر ارشادِ خداوندی ہے۔

وَ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا	اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو

(المزمل، ۷۳:۸)

اس آیتِ مبارکہ کے دو معانی ہیں: ایک معنی یہ کہ اے انسان تو خدا سے یوں محبت کر کہ تیرا دل دنیا کی ہر محبت سے بے پرواہ ہو جائے، جبکہ دوسرا معنی یہ ہے کہ تیرے دل میں خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق کچھ اس طرح مضبوط ہو کہ دنیا کی ہر وہ چیز جو تجھے خدا سے دور لے جانے والی ہو تو اس سے دور ہو جائے۔ اس اعتبار سے وہ شخص بلا شبہ جھوٹا ہے جو خدا کی محبت کا دعوی بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مال و دولت کی محبت میں بھی گرفتار ہے۔

محبتِ الٰہی کا حقیقی تصور سمجھنے کے لئے اطاعتِ الٰہی کا محبت الٰہی سے جو تعلق ہے اسے جاننا نہایت ضروری ہے، کہ کس طرح سے محبتِ الٰہی انسانی زندگی پر اثر ڈالتی ہے اور

بندہ کس طرح محبت الٰہی کی شرائط پر پورا اتر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان ہر وقت خدا تعالیٰ ہی کو یاد کرتا رہے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یادِ الٰہی میں ہی مصروف رہے، اپنے کاروبار کو بھول جائے، اپنی معاشرتی، تعلیمی، سماجی اور دوسری ذمہ داریاں بھول جائے۔ محبت اور اطاعت کا آپس میں جو تعلق ہے اس کے بارے میں یاد رہے کہ ایمان باللہ ہم سے جس محبت کا تقاضا کرتا ہے، وہ ہرگز ایسی محبت نہیں، جو انسان کو دنیوی زندگی کے فرائض ادا کرنے سے غافل کر دے۔ یہ محبت کوئی ایسا جذبہ بھی پیدا نہیں کرتی، جس سے انسان معاشی، معاشرتی اور عائلی ذمہ داریوں کو نبھانے سے غافل ہو جائے۔ اس کے برعکس اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ انسان عائلی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی ذمہ داریاں جس قدر دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ اور احکام الٰہی کے مطابق انجام دے گا وہ ہی اللہ کی اطاعت شمار ہوں گی۔

اس لئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	اے پیغمبر (ﷺ) فرما دیجئے، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، پھر اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔
(آل عمران، ۳:۳۱)	

بلاشبہ سچی اور بے غرض محبت اسی کو کہا جاتا ہے کہ آدمی ہر حال میں اس کام کو کر گزرے جس کے کرنے کا محبوبِ حقیقی نے حکم دیا ہے اور اس کام سے رک جائے جس سے اس نے منع کیا ہے۔

12 تعلق باللہ اور اس کی اہمیت (۱)

یہ سوال بالعموم ذہن میں ابھرتا ہے کہ تعلق باللہ کیا ہے اور ایک مسلمان کی زندگی میں اس کا کیا مقام ہے؟ اس کا جواب سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ تعلق باللہ، اللہ کی ذات سے خاص وابستگی، نسبت، بندگی کی سچائی اور اس محبت کے والہانہ پن کا نام ہے جو بندہ ہونے کے ناتے ہر مسلمان کے دل میں اپنے خالق اور معبودِ حقیقی کے لئے ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ یہ تعلق بندگی ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ یہ نسبت جس قدر محکم اور پختہ ہوگی اس طرح اس کا مقام و مرتبہ عوام کی نگاہ میں بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں انسان کا افضل و برتر ہونا اس کی نسبتِ بندگی کے استحکام پر منحصر ہے۔

آج اس کے مادہ پرستانہ دور کے شور وشر میں یہ تعلقِ بندگی بجائے مضبوط ہونے کے کمزور پڑ گیا ہے۔ تعلقِ بندگی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے ہم اس کے تین پہلوؤں یعنی (۱) تعلق باللہ کی ضرورت (۲) تعلق باللہ کمزور پڑنے کے اسباب اور (۳) تعلق باللہ کی بحالی کیسے ممکن ہے؟ کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیں گے۔

(۱) تعلق باللہ کی ضرورت کیا ہے؟ اس حوالے سے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے مالک کے حضور سراپا نیاز بن کر رہے اور اس کے حکم کے آگے چوں نہ کرے کہ یہی بندگی کا تقاضا ہے جس کی حقیقت کو قرآن مجید نے بڑے واضح انداز میں یوں بیان فرمایا ہے۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَO	اور میں نے جن اور انسانوں کو پیدا ہی عبادت کے لئے کیا ہے(تا کہ ان کا بنیادی تعلق بہر حال اللہ ہی سے رہے)
(الذاریات،۵۱:۵۶)	

زندگی کا بہر حال یہی مقصد ہے اور اس مقصد کو بجالانے میں انسان کا اپنا فائدہ ہے۔امتِ مسلمہ کو بالخصوص اس آیت مبارکہ کے ذریعے یہ نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اللہ سے اپنے اس تعلق کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے اور کبھی اس مقصد سے غافل نہ ہونے پائے۔

اللہ کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو اس کی یاد سے آباد رکھے اور تمام فانی محبتوں، چاہتوں اور نفسانی خواہشوں کے بتوں کو اپنے دل سے باہر نکال کر اس کی ذات کو اپنی محبتوں اور چاہتوں کا مرکز بنالے۔انسان کو یہ فرمانِ الٰہی ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنِ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ط	لوگوں کے لئے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے۔(جن میں) عورتوں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشان کئے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)
(آل عمران،۳:۱۴)	

اس آیت کریمہ میں وہ چیزیں گنوائی گئی ہیں جو نفس کو بہت مرغوب ہیں،ان میں زن، زر اور زمین کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور مال کے ساتھ اس کی محبت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا۔

وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ○ (الفجر،۸۹:۲۰)

اور تم مال و دولت سے حد درجہ محبت رکھتے ہو۔

قرآن مجید نے مادی نفسانی محبتوں کو ایک حد میں رکھنے کے ضمن میں ایک معیار مقرر کیا ہے جس کو اس آیۂ کریمہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط (التوبہ،۹:۲۴)

(اے نبی مکرم ﷺ) آپ فرما دیں اگر تمہارے باپ (دادا) اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں) اور تمہارے بھائی (بہنیں) اور تمہاری بیویاں اور تمہارے (دیگر) رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے (محنت سے) کمائے اور تجارت و کاروبار جس کے نقصان سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہانتک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے۔

قرآن نے اللہ کے ساتھ حقیقی تعلقِ محبت کو یقینی بنانے کے لئے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ انسان غیر اللہ کی محبتوں کو دبانے کے لئے شعوری کوشش کرتا رہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی محبت کے دعویٰ میں سچا ہے تو اس پر پورا اترنے کے لئے اسے عملی ثبوت فراہم

کرنا ہوگا، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں ایک واقعے کا تذکرہ خالی از فائدہ نہ ہوگا:

معرکۂ بدر میں خونی رشتوں کے مقابلے میں ایمان اور محبتِ الٰہی کی فوقیت اچھی طرح کر سامنے آئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے جو مسلمانوں کے ساتھ مقابلے میں لشکر کفار میں تھا اپنے والد گرامی کو بتایا: ابا جان جنگ میں کئی ایسے موقعے آئے جب آپ میری تلوار کی زد میں تھے لیکن والد سمجھ کر میں نے آپ کو چھوڑ دیا، اس پر جناب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹا اگر تم ایک بار بھی میری زد میں آتے تو کبھی محبت پدری سے مغلوب ہو کر تمہاری جاں بخشی نہ کرتا اس لئے کہ تم اس وقت دشمنانِ خدا کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ ایمانی رشتہ سب دنیاوی رشتوں پر حاوی ہے۔ اور عملی زندگی میں ایسا ہونا بھی چاہیے۔

13 تعلق باللہ اور اس کی اہمیت (۲)

اب ہم دوسرے پہلو یعنی تعلق باللہ کمزور پڑنے کے اسباب کا ذکر کریں گے۔ یوں تو بہت سے اسباب ہیں جو بندے اور اس کے خالق کے تعلق کو کمزور کرنے کا باعث بنتے ہیں، مگر ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیں تو دو سبب ایسے ہیں جو اس ضمن میں مرکزی حیثیت جبکہ ان کے مقابلے میں باقی اسباب ثانوی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ دو اسباب یہ ہیں:

(۱) تقویٰ کی کمی (۲) ہوا و ہوس کی حکمرانی

(۱) تقویٰ اللہ تعالیٰ کے خوف اور ہر قدم پر اس سے ڈرنے کا نام ہے۔ اگر اللہ کا ڈر دل میں موج زن ہو تو بندہ جرم اور خطا کرنے سے پہلے سو بار سوچتا ہے اور اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قائم کی ہوئی حدود پھلانگنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ محاسبے کا خوف اسے برائی سے روکے رکھتا ہے۔ لیکن افسوس آج ہم حالات کا جائزہ لیتے ہیں، تو واقعات کے پسِ منظر میں ایک ایسا معاشرہ دکھائی دیتا ہے، جو تقویٰ کے نور سے محروم ہو گیا ہے۔ موجودہ صورتِ حال ایسا نقشہ پیش کرتی ہے کہ نہ ملکی قوانین کا کوئی احترام باقی ہے اور نہ ہی شرعی ضابطے اور قانون کے تقدس کا کسی کو کوئی پاس ہے۔ موجودہ مادیت زدہ ماحول میں انسان کا ضمیر سسک سسک کر مر رہا ہے۔ اخلاقی بندھن اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ زمانے کی آنکھ میں نہ حیا باقی ہے نہ احساسِ جرم سے کوئی پیشانی ندامت کے پسینے سے تر ہوتی ہے۔ حرام و حلال کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ کاروانِ ملت کی بے بسی اور بے چارگی علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی یاد دلاتی ہے:

وائے ناکامی متاعِ کاروان جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تمدن اور ثقافت کی آزادی کی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ادب تہذیب اور کلچر کے نام پر فحاشی، عریانی اور بے راہروی کوفروغ دیا جارہا ہے۔ بے حیائی اور بے حمیتی کے جن نے بوتل سے نکل کر وہ تباہی مچائی ہے کہ ہر طرف دہشت گردی، قتل و غارتگری ، اغوا، دھونس، دھاندلی، غبن، خیانت اور نفرت وعداوت کا بازار گرم ہے۔ کرپشن اور بدعنوانی کے کینسر نے ہر ادارے کو مفلوج اور نیم جان کر دیا ہے ۔ خودکشی اور خودسوزی کی وارداتیں آئے دن اخبارات کی سرخیوں کا عنوان بنتی ہیں، لوگوں کی ایک کثیر تعداد خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کررہی ہے، تقویٰ کے نہ ہونے سے انسان نے خون پینے والے بھیڑے کا روپ دھارلیا ہے اور ''**اسفل السافلین**''کی صورت میں وہ ''ڈریکولا'' بن گیا ہے، جسے خلافِ انسانیت ذلیل ترین حرکت کرتے ہوئے بھی کوئی شرم اور عار محسوس نہیں ہوتی۔

یہ گھمبیر صورتِ حال جس کی کچھ جھلکیاں اوپر دکھائی گئی ہیں، اس سبب سے پیدا ہوئی ہے کہ لباسِ تقویٰ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دی گئی ہیں، جس کے نتیجے میں انسان کا تعلقِ بندگی اپنے مولا کے ساتھ کٹ کر رہ گیا ہے اور اس کا اپنے خالق و مالک کے ساتھ وہ رشتہ نہیں رہا جو اس کا بندہ ہونے کے ناتے ہونا چاہیے تھا۔

(۲) اللہ سے بندے کے تعلقِ بندگی کے کمزور ہونے کا ایک اور اہم سبب ہوس کی حکمرانی ہے۔ آج بدقسمتی سے زندگی کے ہر شعبے میں ہوس نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں، جس نے انسان کو خودغرض، مطلب پرست، دھوکہ باز، لالچی، فاسق وفاجر، متکبر اور حرص وہوا کا بندہ بنا کررکھ دیا ہے۔ معاشرے میں اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہورہی ہیں۔ لوٹ مار، ذخیرہ اندوزی، رہ زنی، بددیانتی، نوسربازی، ملاوٹ اور ناپ تول میں کمی جیسی بیماریاں اور

خرابیاں عام ہیں، جوسب ہوس کی پیدا کردہ ہیں۔ ہوس نے انسانی رشتوں کا تقدس مجروح کر دیا ہے، دلوں سے محبت، مروت اور اخلاص چھین لیا ہے اور خود غرضی، ابن الوقتی کے شعلوں کو ہوا دے کر انسانیت کے خرمن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا ہے۔

ہوس کی یوں تو ان گنت شکلیں ہیں مگر ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار نے وہ گل کھلائے ہیں کہ تہذیب و انسانیت سر پیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ بے وفائی، دغا بازی اور بے ضمیری انسانی مزاج میں اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور آگے نکلنے کی دوڑ میں انسان اخلاقیات کے سب سبق بھول چکا ہے۔ دور حاضر کا بڑا المیہ یہ ہے کہ اپنے مدِ مقابل کو نیچا دکھانے کے لئے نہ صرف ہر غیر اخلاقی اور غیر انسانی حربہ اختیار کیا جاتا ہے بلکہ پوری کوشش کی جاتی ہے کہ حقدار کو اس کا حق نہ ملنے پائے چاہے وہ کتنا ہی باصلاحیت اور قابلیت سے مالا مال کیوں نہ ہو۔

یہ بات اب پوری دنیا کو معلوم ہے کہ ہمارے حکمران نام نہاد جمہوریت کی آڑ میں زیادہ سے زیادہ آمرانہ اختیارات اپنی ذات میں جمع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے اقتدار کی کرسی کو مضبوط کرنے کے لئے ہر ادارے کو تباہ کرنے سے ذرہ برابر نہیں ہچکچاتے۔ پاکستان کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ مارشل لاؤں اور نیم جمہوری حکومتوں سے عبارت ہے۔ جو بھی تختِ اقتدار پر بیٹھا اسے فوج نے ہی اقتدار و اختیار کی مسند سے ہٹایا۔ اس کا سبب وہی ہے جس کی نشان دہی اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں کی تھی۔

ہوئی دین و ملت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

ماضی و حال کے ہر حکمران طبقہ کے امراء و وزراء خواہ ان کا تعلق جمہوری، نیم جمہوری اور فوجی حکومتوں میں کسی سے ہو، ہوا و ہوس کے غلام تھے۔ انہوں نے بجائے عوام

کی خدمت کے ملک اور قوم کو دل کھول کر لوٹا اور ملکی معیشت کو اپنے اللوں تللوں سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔آج پاکستانی قوم غیر ملکی قرضوں کے بوجھ تلے چیخم پکار کر رہی ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ہر پیدا ہونے والا بچہ تقریباً قرضے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ بُرے دن ہمیں اس ملک گیر ہوس نے دکھلائے ہیں۔جس نے ہماری قومی عزت وآبرو کو غیروں کے ہاتھ گروی کر رکھا ہے اور ہمارے لئے عزت اور غیرت سے زندہ رہنے کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

14 تعلق باللہ اور اس کی اہمیت (۳)

اب ہم تیسرے پہلو کا ذکر کریں گے کہ تعلق باللہ کو کیسے بحال کیا جائے۔ اس سے پہلے ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ آج کا دورِ زوال اپنی اس انتہا کو پہنچ چکا ہے کہ بندے کا اللہ سے تعلق بالکل کٹ کر رہ گیا ہے۔ یا پھر اتنا کمزور پڑ گیا ہے کہ اعتقادی، اخلاقی، روحانی، سماجی اور معاشرتی خرابیوں نے بری طرح انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہاںتک کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق محض واجبی اور رسمی سا رہ گیا ہے۔

اس تعلق کو بحال کرنے کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اسے محض ''قال'' تک نہ رہنے دیا جائے بلکہ اسے ''حال'' میں بدل دیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تعلق کی بحالی کے کیا تقاضے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تعلقِ باللہ کو درج ذیل پانچ تقاضوں کو پورا کر کے بحال کیا جاسکتا ہے۔ وہ پانچ تقاضے اس طرح ہیں (۱) ذکرِ الٰہی (۲) محبت الٰہی (۳) خشیتِ الٰہی (۴) اطاعتِ الٰہی (۵) عبادتِ الٰہی۔ یہاں ہم پہلے تقاضے کو ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ جس شئے سے محبت ہو اس سے ایک ایسا تعلق پیدا ہو جاتا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے اور آتے جاتے ہر بہانے اسے یاد کیا جاتا ہے۔ اس محبت میں جس قدر شدت ہوگی اس قدر اس میں والہانہ پن آجائے گا۔ پھر اگر محبوب صاحبِ حسن و جمال اور عظمت و قدرت والا ہو تو اس کا ذکر بھی کثرت کے ساتھ اہلِ محبت کے حلقوں میں کیا جائے گا۔ یہ تو محبوب مجازی کی بات تھی، جس کی داستانوں کے کردار، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا

اور شیریں فرہاد کے روپ میں محبت کی سنگلاخ اور پرخار وادیوں میں ہوش وحواس سے بیگانہ، پاؤں میں آبلے اور سر پر خاک اوڑھے نظر آئے۔ لیکن جب محبوبِ حقیقی کی یاد کسی کے دل میں گھر کر جائے تو اس بندے کی دیوانگی اور جوش وخروش کا عالم کیا ہوگا اس کا محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طالبِ حق کو شرابِ عشقِ الٰہی کا ایک گھونٹ میسر آجائے اس کی نظر میں دنیا جہان کی ساری نعمتیں اور لذتیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور وہ محبوبِ حقیقی کے ایک اشارے پر اپنی جان بھی یہ کہتے ہوئے قربان کر دیتا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قرآنِ حکیم نے اہلِ ایمان کی اللہ سے محبت کی بنیادی شرط بیان کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط

(البقرہ،۲:۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔

اس ارشادِ ربانی میں مومن ہونے کے لئے اللہ کے ساتھ شدید محبت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بندہ ایمان کی حلاوت اور لذت سے محروم رہتا ہے۔

تصوف اور طریقت کی دنیا میں ذکرِ الٰہی کا مقام بہت اونچا ہے۔ قلب و باطن کی صفائی کے لئے اہل اللہ ذکر الٰہی پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ بلاشبہ ذکرِ الٰہی دلوں کے زنگ کو دور کرنے کے لئے ریگ مار کا کام دیتا ہے۔ اس کی تصدیق خود سرکارِ دوعالم ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے ہوتی ہے۔

لکل شئی صقالة وصقالة القلوب ذکر اللہ.	ہر چیز کو چمکانے کے لئے صیقل کی ضرورت ہوتی ہے اور دلوں کو صیقل کرنے کے لئے اللہ کا ذکر ہے۔
مشکوۃ المصابیح، ۱۹۹، کتاب الدعوات	

اس پر صحیح بخاری کی ایک حدیث مبارکہ بھی ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان جو اس کے دل پر بیٹھا ہوتا ہے پرے ہٹ جاتا ہے۔ اس ارشادِ نبوی ﷺ سے واضح ہے کہ شیطانی اثرات سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو کثرت سے ذکرِ الٰہی کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں اور جو ذکرِ الٰہی سے غفلت برتتے ہیں، وہ اس سعادت سے محروم رہتے ہیں اور ان کے دل پر شیاطین اپنا قبضہ جما لیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں جا بجا اور کثرت سے ذکر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ درجِ ذیل قرآنی ارشادات اس پر شاہد ہیں۔

١. اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (آل عمران، ۳:۱۹۱)	یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اس کی عظمت اور حسن کے جلوؤں) میں فکر کرتے رہتے ہیں۔
٢. وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ. (آل عمران، ۳:۴۱)	اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرو اور شام اور صبح اس کی تسبیح کرتے رہو۔

اوپر والی آیت میں حضرت زکریا علیہ السلام پر اللہ کے کرم کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ وہ تین دن اشاروں کے سوا کوئی بات نہ کہہ سکیں گے اور اس اضطراری حالت میں انہیں یہ تلقین کی گئی کہ وہ کثرت سے اپنے رب کا ذکر کرتے رہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب انسان اضطراب و بے تابی کی حالت سے دوچار ہو تو کثرت کے ساتھ ذکرِ الٰہی اس کے لئے تسکین اور اطمینان کا موجب بن جاتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُO جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ (الرعد، ۱۳:۲۸)

بیشک ذکرِ الٰہی دل کی غذا ہے اور اس سے سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ اگر بندہ ذکرِ الٰہی کو اپنا وظیفہ بنا لے تو اس سے اس کا اضطرابِ قلب دور ہو جاتا ہے اور اللہ کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے جسے صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جنہیں ذکرِ الٰہی کی لذت اور چاشنی نصیب ہو جائے۔ ایسے خدا مست لوگ ہر وقت اللہ کے ذکر سے سرشار رہتے ہیں اور ان پر ہر وقت ایک کیف کا عالم طاری رہتا ہے۔

15 ایمان بالرسالت (رسالت پر ایمان)

اسلام کا تصورِ رسالت

اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس ''رسالت'' کا ایک ٹھوس اور جامع تصور پیش کیا، جس نے نہ تو رسالت کو بڑھا کر خدا یا خدا کی اولاد کے درجے پر پہنچایا اور نہ گھٹا کر عام انسانوں کے برابر قرار دیا۔ دینِ مبین نے رسالت و نبوت کا ایسا جامع، کامل اور بے مثل نظریہ پیش کیا جس میں نورِ حق کی صداقت اور چمک دمک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر خطے اور نسل انسانی کے ہر طبقے کی طرف، اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ — اور کوئی امت نہیں مگر اس میں کوئی نہ کوئی آگاہ کرنے والا ضرور گزر چکا ہے۔ (فاطر، ۳۵:۲۴)

قرآن کریم کی یہ آیت رسالت کے عام ہونے کو بیان کرتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کرہ ارض کا ہر وہ خطہ جہاں چند انسانوں نے ملکر کوئی معاشرہ تشکیل دیا ہے، کسی دور میں اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء کے فیضان سے خالی نہیں رہا۔

بالآخر قیامت تک کے تمام ادوار کے لئے خاتم الانبیاء سرورِ کون و مکان، فخرِ موجودات ﷺ کو مبعوث کر دیا گیا۔ اور وہ دنیا کے سب سے عظیم انقلاب اور سب سے بڑے دین کے بانی قرار پائے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى — وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت

عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًاO ہے جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ اہلِ عالم کو ڈر سنائے۔ (الفرقان، ۱:۲۵)

خدا تعالیٰ نے آپ کے دامن کو عالمین کی ہدایت کے سامان کے ساتھ ساتھ تمام جہانوں کی رحمتوں سے بھی بھر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَO اور (اے محبوب) ہم نے آپ کو تمام عالمین کے لئے رحمت (بنا کر) بھیجا ہے۔ (الانبیاء، ۱۰۷:۲۱)

اب جس طرح تمام جہانوں کا پروردگار ایک ہی ہے:

اسی طرح کل کائنات ایک نبی و رسول خاتم النبین ﷺ کے پرچمِ رحمت تلے جمع کر دی گئی۔ اور یوں توحیدِ باری کے ساتھ ساتھ توحید و رسالت کا تصور بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ نظامِ رسالت و نبوت کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ اس مسئلے کے چار پہلو ہیں۔

۱۔ انسان کا مقصدِ تخلیق اور ضرورتِ رسالت

۲۔ نسلِ انسانی کی جوابدہی کا تصور اور ضرورتِ رسالت

۳۔ انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورتِ رسالت

۴۔ انسانی علم کی تکمیل اور ضرورتِ رسالت

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خدا نے انسان تک اس کا مقصدِ تخلیق پہنچانے کا کوئی انتظام بھی کیا یا نہیں؟ عقل اس بات کو نہیں مانتی کہ انسان کا کوئی مقصدِ تخلیق تو ہو مگر

اسے اس کے مقصد حیات سے آگاہ کرنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا ہو۔اس سے تو (معاذ اللہ) خدا کی ذات والا صفات پر الزام آتا ہے کہ اس نے اتنی وسیع وعریض کائنات پیدا تو کردی مگر انسان کو یہ بتانے کا کوئی انتظام نہیں فرمایا کہ اس کا اس کائنات میں اور خود اس کائنات کا اس کے دل ودماغ میں مقام اور درجہ کیا ہونا چاہیے؟ آیا انسان کائنات اور اس کے موجودات کی خدمت وپرستش کے لئے ہے یا کائنات خود اس کی خدمت واطاعت کے لئے ہے؟ اور یہ کہ یہاں اسے کیسے شب وروز گزراوقات کرنی ہے؟ کس کا حکم ماننا ہے؟ کس کا نہیں ماننا؟ اس مضمون کو سورۃ الانعام میں کس خوبی سے بیان کردیا گیا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ط (الانعام،۶:۹۱)	اور ان لوگوں نے خدا کی قدر شناسی کا حق ادا نہ کیا۔جب انہوں نے یہ کہہ دیا کہ خدا نے کسی انسان پر وحی (اور کتاب وغیرہ) کچھ بھی نازل نہیں کیا۔

گویا یہ کہہ دینا کہ خدا نے اس دنیا کی مادی وجسمانی ضروریات کی تکمیل تو کی ہے مگر روحانی وباطنی ضروریات کو تشنہ چھوڑ دیا ہے،اس طرح تو نہ صرف ذاتِ خداوندی کی سخت ناقدری اور ناشکری ہوگی۔بلکہ مقام واحکامات الٰہیہ سے ناآشنائی بھی ہوگی۔

16 ایمان بالرِسالت کے تقاضے

ایمان بالرسالت کے دو درجے ہیں:

۱۔اصل ایمان...... یہ ایمان کی وہ بنیاد ہے جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کا زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کے ذریعے پختہ ہوتی ہے۔

۲۔کمالِ ایمان...... یہ ایمان کامل ہی ہے جو بعض شرائط اور تقاضے صحیح طور پر بجالانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔اس کے چار تقاضے اس طرح ہیں:

(۱)محبتِ رسول (۲)تعظیمِ رسول (۳)نصرتِ رسول (۴)اطاعتِ رسول

جہاں تک اصل اور کمالِ ایمان کا تعلق ہے۔ دونوں ایک جیسے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابوامامہ اور حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نبوی ﷺ میں ارشاد ہے:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَ مَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔

جس نے اللہ کے لئے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کیلئے کسی سے بغض رکھا اور اللہ ہی کے لئے دیا اور اللہ ہی کے لئے روکا پس اس نے ایمان مکمل کرلیا۔

سنن ابوداؤد،۲:۲۹۵، کتاب السنۃ، رقم حدیث:۴۶۸۱

ان شرائط پر پورا نہ اترنے کے باوجود بندے کا اللہ پر ایمان رکھنا اصلاً ثابت ہے مگر وہ ناقص رہ جاتا ہے۔ جہاں تک ایمان بالرسالت میں اصلِ ایمان اور کمالِ ایمان کی حدود کا تعلق ہے، اس میں اس کی حیثیت کا تعین ضروری ہے۔اوپر بیان کئے گئے چار تقاضوں میں سے پہلے دو (محبت اور تعظیم) اصلِ ایمان کا حصہ ہیں۔ جبکہ بقیہ دو (اطاعت اور نصرت) کمالِ ایمان کا۔

اگر نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ سرے سے محبت ہی نہ ہو اور نہ دل میں آپ ﷺ کی تعظیم کا کوئی جذبہ ہی موجود ہو بلکہ قلبی و باطنی سطح پر ایک طرح کی لاتعلقی ہو تو ایسی صورت حال ایمان کی نفی کو ظاہر کرتی ہے۔

اسکے برعکس اگر محبتِ رسول ﷺ اور تعظیم رسول ﷺ کے عناصر انسان کی طبعیت میں پائے جائیں، مگر بدقسمتی سے اطاعت اور نصرت کی توفیق نہ ہو تو پھر ایمان اصلاً تو ثابت ہو گا مگر ناقص رہ جائے گا۔اس کا کمال اطاعت اور نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔ہاں محبت اور تعظیم کے دو درجے ہیں: (۱) محض محبت و تعظیم (۲) شدید محبت و تعظیم

اگر حضور ﷺ کی ذات سے محض اس قدر محبت اور تعظیم کا تعلق ہو کہ انسان کا دل آپ کی یاد سے کچھ مانوس ہو، آپ کے ذکر سے کچھ لذت اور سکون پائے اور اس کے اندر ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی گستاخی و بے ادبی کا بھی شائبہ نہ ہو تو وہ صاحب ایمان تصور کیا جائے گا اور اگر یہی محبت و تعظیم اس کے قلب و باطن میں زور پکڑ جائے اور اتنی شدت اختیار کر جائے کہ نہ تو کسی مخلوق کی محبت واقعۃً آپ کی محبت کا مقابلہ کر سکے اور نہ کسی کی تعظیم اس درجے کو پہنچے تو پھر اس ایمان کو ایمانِ کامل تصور کیا جائے گا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُ كُمْ وَ اَبْنَآءُ كُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَO

فرما دیجئے! اگر تمہارے باپ، دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہارا کنبہ اور تمہارے اموال جو تم کماتے ہو، اور تمہارا کاروبار جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو اس وقت کا جب اللہ اپنا

حکم (عذاب) نازل کرے۔ بیشک اللہ ایسے سرکشوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (التوبہ،۹:۲۴)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کو دنیا اور اس میں پائے جانے والی ساری کی ساری محبتوں سے بڑھ کر قرار دیا گیا ہے اور اسے ہی علامت ایمان و ہدایت کہا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین۔

(صحیح مسلم،۱:۴۹، کتاب الایمان، رقم حدیث:۷۰)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار نہیں ہوسکتا۔ جب تک مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ رکھے۔

چونکہ محبتِ رسول ﷺ ایمان بالرسالت کی بنیاد تھی اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے دست اقدس پر ''محبت'' کی بیعت کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت صفوان بن قدامہ رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کیا:

یارسول اللہ ﷺ ناولنی یدك ابایعك فناولنی یده فقلت: یارسول اللہ ﷺ انی احبك قال: المرء مع من احب۔

(الشفاء،۲:۱۶)

یا رسول اللہ ﷺ اپنا دست اقدس میرے آگے کیجئے۔ میں آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنا دست اقدس میرے آگے بڑھایا۔ میں نے بیعت کرتے ہوئے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ مجھے آپ سے محبت ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہوگی۔

17 ایمان بالآخرت اور قرآن حکیم (۱)

قرآن حکیم نے آخرت پر ایمان لانے کے سلسلے میں جو دلائل دیئے ہیں ان کو ہم تین بنیادی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ زندگی کے ارتقاء کا قرآنی تصور اور تصورِ آخرت

۲۔ نظامِ کائنات کی بقاء اور تصورِ آخرت

۳۔ مکافاتِ عمل اور تصورِ آخرت

ان تین بنیادی نکات کی مختصر تفصیل ہم باری باری اس طرح بیان کریں گے۔

۱۔ قرآن نے ایمان بالآخرت اور انسانی زندگی کے ارتقاء کے حوالے سے ایک مخصوص نظریہ پیش کیا ہے جس میں اس کے آغاز کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا O	بیشک انسان پر زمانے میں ایک وقت ایسا بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ (الدھر، ۷۶:۱)

گویا انسانی زندگی کی ابتداء ایسی حالت میں ہوئی کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا، یعنی عدم سے ظہور میں آنے سے پہلے انسان نام کی کوئی چیز وجود میں نہیں تھی بلکہ خود کائنات کا نام و نشان تک نہ تھا۔

پھر اللہ کی مشیت نے چاہا تو حرف ”کُن“ سے یہ کائنات وجود میں آ گئی اور حالتِ عدم سے حیات و موت کے سلسلے کا آغاز ہو گیا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ جب کچھ بھی موجود نہ تھا اور ہر چیز عدم کے پردے میں تھی تو پھر عدم کی حالت میں یہ حکم کیسے دیا گیا اور کس کو دیا گیا کہ ''ہو جا'' کیونکہ ہر حکم کے لئے حکم دینے والے کے ساتھ حکم دیا جانے والا (محکوم علیہ) کا ہونا ضروری ہے، جسے مخاطب کہا جاتا ہے۔ سائنس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں کہ کائنات میں کوئی ایسا وقت بھی آیا ہوگا جب خدا کی ذات کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَہٗ كُنْ فَيَكُوْنُO	اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرما دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔
(یٰسین، ۳۶:۸۲)	

اوپر ذکر کی گئی آیت میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ''اَرَادَ'' کے بعد لفظ ''شَیٔ'' آیا ہے اور شَیٔ کا معنی ہے وہ چیز جس کا ارادہ کیا گیا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ارادہ ایک ذہنی عمل ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ جسم، جسمانی عمل، ذہن اور ذہنی عمل وغیرہ سے پاک ہے۔ محض بات سمجھانے کے لئے یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا، مگر اس کے علم میں کائنات اور اس میں پیدا کی جانے والی ہر شئے کا نقشہ موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ اسے کیا چیز پیدا کرنی ہے اور کس شکل وصورت میں پیدا کرنی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں موجود تخلیق کے اس خاکے کو خارجی وجود دینا چاہا تو وہ ذہنی شَیٔ قرار دیا گیا اور اسے یہ حکم دیا گیا کہ ''ہو جا'' بس وہ خاکۂ عالمِ خارج میں شکل اور صورت اختیار کر گیا۔ اسی توجہ الٰہی کا نام ''امرِ کُن '' ہے۔

بہرحال خالقِ کائنات نے مختلف مخلوقات کے وجودِ علمی کو اپنے خاص توجہ کا مرکز بنایا تو اسے دو صفتیں (۱) صفتِ استمرار اور (۲) صفتِ منظوریت عطا کر دیں۔ صفتِ استمرار

کا مفہوم یہ ہے کہ اس شئی کے علمی وجود کو ظاہری وجود میں شکل پذیر کر کے اسے باقی رہنے کی قوت بخش دی۔ جبکہ صفتِ منظوریت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی اس چیز کو دیکھنا چاہے تو اسے دیکھ سکے۔ یعنی وہ وجودِ عالمِ خارج میں قائم بھی رہے اور دیکھنے والے کو دکھائی بھی دے۔

یہ ایک طویل بحث ہے، مختصراً حقیقت یہ ہے کہ وہ وجود جو وحدتِ الٰہی کا مظہر تھا اور جس سے تخلیق کائنات کا آغاز ہوا اور جو پہلے باری تعالیٰ کے ارادۂ تخلیق کا پرتو قرار پایا ''نورِ محمدی ﷺ'' تھا جس کا ذکر حدیثِ پاک میں موجود ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا، یہاں سے کائنات کا آغاز ہوا، اور یہ عمل رفتہ رفتہ جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ''اَمرِ کُن'' سے عالمِ طبعی کو پیدا کیا، جس میں لوح و قلم، عرش، کرسی سمیت لاکھوں کروڑوں اشیاء شامل ہیں۔ پھر عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات وجود میں آئے۔ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور مرتب کردہ منصوبے کے تحت ہوا اور یہ ایک سوچی سمجھی سکیم تھی۔ محض بے مقصد اور جامد عمل نہ تھا، جیسا کہ بعض مادہ پرست ذہن کائنات کے اس ارتقاء کو محض اتفاقیہ حادثہ قرار دیتے ہیں۔

خالقِ موجودات نے اپنی تخلیقی صفات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف آسمانی مخلوق یعنی فرشتوں کو پیدا کیا تو دوسری طرف قسم قسم کی حیواناتی زندگی کے ساتھ لطیف قسم کی جناتی زندگی کو مکمل کیا اور پھر دنیائے حیوانات کو خود شعوری اور خود آگہی کی صفت عطا کر کے اپنے درجۂ کمال تک پہنچا دیا تو تخلیق کے آخری مرحلے میں حضرت انسان کو وجود میں لایا گیا۔ انسان خدا تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار قرار پایا۔ وہ صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی صناعی اور خلاقیت کا سب سے مکمل نمونہ تھا۔ جس کی بناء پر اسے دنیائے بحر و بر کا حکمران بنا دیا گیا۔

انسانی زندگی دوسری اشیاء کی زندگیوں سے ارتقاء کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس کی مرحلہ وار زندگی میں موت و حیات کے کئی ادوار میں سے گزارا گیا۔ اس سلسلے میں ارشادِ

باری تعالیٰ ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌO

(العنکبوت، ۲۹:۲۰)

آپ فرما دیجئے کہ زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح آفرینش کی ابتدا کی پھر وہی اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی عطا کرے گا، یقیناً اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

18 ایمان بالآخرت اور قرآن حکیم (۲)

ہم مرحلہ وار حیات کا ذکر کر رہے تھے جس کا حوالہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں دیا گیا ہے۔ انسانی زندگی میں کبھی حیات کا مرحلہ آیا اور کبھی موت کا لیکن نہ حیاتِ انسان کی آخری منزل تھی اور نہ موت۔ اس مرحلے کے اختتام پر پھر ایک موت آنے والی ہے۔ جس کے بعد کی زندگی کو عالمِ برزخ کہا جاتا ہے۔ اس عالمِ برزخ کا اختتام جس زندگی پر ہو گا اسے حیاتِ آخرت کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ان مختلف مراحل کے بارے میں ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا ہے:

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O

(الروم، ۳۰:۵۰)

پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار دیکھئے وہ کس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً وہ ضرور مردوں کو بھی زندگی عطا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی تصور کو ایک جگہ یوں واضح کیا گیا ہے:

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ O

(فاطر، ۳۵:۹)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے بھیجیں ہوائیں پھر وہ ہوائیں بادل ابھارتی ہیں پھر ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف رواں کرتے ہیں پھر اس مردہ زمین کو موت کے بعد بارش کے ذریعے زندہ کر دیتے ہیں۔

بس ایسا ہی قیامت کے دن جی اُٹھنا ہو

گا۔

اس طرح شروع ہونے والا حیاتِ انسانی کا دور انسان کے سفر ارتقاء کا نقطۂ کمال ہے۔ جس کی طرف قرآن حکیم نے گذشتہ آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔

اسی طرح حیاتِ برزخی کے اختتام پر حیاتِ انسانی کا ایک اور دور شروع ہوگا جو حیاتِ انسانی کے سفرِ ارتقاء کا نقطہ کمال ہوگا۔ قرآن حکیم سے ایک مقام پر تصورِ آخرت کا استدلال اس طرح کیا گیا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَO

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ (المومنون، ۲۳:۱۱۵)

قرآن مجید نے نظامِ کائنات کی بقاء پر جو ادوار گزرے ہیں۔ اس پر تصورِ آخرت کے استدلال کی عمارت کھڑی کی ہے۔

وہ یوں کہ قدرت نے اس زمین کو نہ جانے کتنے اربوں سال بعد جلتے ہوئے سورج کے دائرے سے خارج کیا اور پھر کروڑوں سال اسے ٹھنڈا ہونے میں لگے۔ اس کے بعد جب اس کی سطح پر زندگی کے آثار پیدا ہوئے تو ابتداء میں جمادات، نباتات پھر حیوانات اور سب سے آخر میں یہاں انسانی حیات کو پیدا کیا۔ پھر انسانی زندگی کو اعلیٰ مراتب اور اقدارِ حیات سے روشناس کرنے کے لئے نبیوں اور رسولوں کو الہامِ غیبی کے ساتھ مبعوث کیا گیا اور روحانی مدد بھی بہم پہنچائی جاتی رہی۔

قرآن حکیم میں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس پوری کائنات کو مسخر کر کے انسان کے تابع کر دیا گیا جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ، ۱۳:۴۵)

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔سب کو اس نے تمہارے تابع کر دیا۔

جب یہ سارا نظامِ کائنات اور اس کی ایک ایک شئے انسان کے تابعِ فرمان کر دی گئی تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ کائنات کی عمر تو کروڑہا برس پر مشتمل ہو، مگر خود انسان کو اوسطاً ساٹھ ستر برس کی عمر دے کر یوں ختم کر دیا جائے کہ وہ گویا اس کائنات میں آیا ہی نہ تھا اور پھر یہ کہ پوری کائنات تو اس کی خدمت اور تصرف کے لئے ہو اور وہ بغیر حساب و کتاب کے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًىO (القیامہ، ۳۶:۷۵)

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

عقلِ سلیم اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ پوری کائنات کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے بعد انسان کو بغیر پوچھ گچھ کے ختم کر دیا جائے اور کوئی اس سے جواب طلبی نہ کرے۔اگر یہ بات مان لی جائے تو نظامِ حیات کا فلسفہ اور حکمت کیا باقی رہ جاتی ہے؟ قرآن کریم نے ایک مقام پر خود کائنات کی قسم کھا کر تصورِ آخرت کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَO (الذاریات، ۲۳:۵۱)

آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی قسم! روزِ قیامت اور آخرت کا آنا اسی طرح قابلِ یقین، یعنی برحق ہے، جس طرح تم بات کرتے ہو۔

19 ایمان بالآخرت اور قرآنِ حکیم (۳)

پہلے دو دروس میں بیان کردہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اتنی بڑی وسیع و عریض کائنات اور اس کے جامع نظام کا ایک ایک وجود صرف اور صرف انسان کے لئے پیدا کیا گیا اور اسی کے لئے باقی ہے، تو اس بات پر کیسے یقین آ سکتا ہے کہ انسان کے فنا ہونے یعنی موت کے بعد اس کی زندگی کا کوئی پہلو باقی نہ رہے گا۔ یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ ساری کائنات تو اس کی خاطر باقی رہے اور وہ جو مقصودِ کائنات ہے اسے بغیر کسی نتیجہ خیز انجام کے ختم کر دیا جائے۔ اب ہم عقیدۂ آخرت کی تیسری بنیاد یعنی مکافاتِ عمل کی طرف آتے ہیں۔

مکافات کا سادہ لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ آپ ٹھنڈا پانی پئیں گے تو لازماً اس کی ٹھنڈک محسوس کریں گے، آگ میں ہاتھ ڈالیں گے تو ممکن نہیں کہ اس کی تپش اور سوزش محسوس نہ ہو، اس طرح دودھ کی تاثیر طاقت اور توانائی دینا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ دودھ پئیں مگر اس کے پینے سے آپ کے جسم میں طاقت اور توانائی نہ آئے۔ اسی طرح زہر کی تاثیر ہلاک کرنا ہے،۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ زہر کھائیں مگر اس کے باوجود ہلاکت و نقصان سے محفوظ رہیں۔ یہ سارے عمل فطرت کے نظامِ مکافات کا حصہ ہیں اور ہر جگہ ایک ہی قانون کارفرما ہے۔ ہر کام اپنے اندر کوئی نہ کوئی تاثیر رکھتا ہے۔ جب بھی وہ کام کیا جائے گا۔ اس کی ذہنی تاثیر اور نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔ جو قدرت نے اس کی سرشت میں داخل کر دیا ہے۔ قانونِ مکافات دنیا کے نظام کو باقی رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اگر یہ خواص اور افعال کے اندر یہ تاثیریں نہ رکھی جاتیں تو نظامِ کائنات کب کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ جو کرو

گے سو بھروگے‘‘۔ایک ایسی سچائی ہے، جس پر ہر کوئی یقین رکھتا ہے۔ایک کسان اپنے کھیت میں گیہوں کاشت کرکے بجا طور پر یہ امید لگائے بیٹھا ہوتا ہے کہ اس سے اسے گیہوں کی پیداوار حاصل ہوگی۔اگر کوئی شخص اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرے کہ اس کھیت سے جو کی فصل حاصل ہوگی تو وہ اس شخص کو پاگل قرار دے گا۔ یہ اس لئے کہ اسے قدرت کے نظامِ مکافات پر اچھی طرح یقین ہے اور وہ وثوق سے جانتا ہے کہ گیہوں سے گیہوں اور جو سے جو ہی پیدا ہوتا ہے۔

لہٰذا جس طرح دنیا کی ہر چیز ایک لگے بندھے نظام کے تحت ایک فطری تاثیر رکھتی ہے اسی طرح انسان کا ہر عمل اچھا ہو تو اچھی اور برا ہو تو بری تاثیر رکھتا ہے۔قرآن حکیم نے اس نظامِ مکافات کی عملی صورت یوں بیان کی ہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُو الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَO (الجاثیہ،۴۵:۲۱)	جولوگ برے کام کرتے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا کردیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اور کیا ان کا یہ گمان ہے کہ ان کی زندگی اور موت دونوں یکساں ہو جائیں گی۔کیا برا حکم لگاتے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات کھول کر بیان کردی گئی کہ یہ ناممکن ہے کہ نیکی کرنے والوں اور برائی کرنے والوں کا انجام ایک جیسا ہو۔دنیا کی عدالتوں سے تو عین ممکن ہے کوئی ظالم اپنے اثر ورسوخ، سرمایہ و دولت، ذاتی تعلقات اور سفارش کی بناء پر سزا پانے سے بچ جائے اور وہ عدالت کا فیصلہ غلط طور پر اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہوجائے، اس طرح یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی مظلوم کی دادرسی نہ ہو اور قانون کی نظر میں ظالم و مظلوم،

گناہگار و نیکوکار اور اطاعت گزار و نافرمان یکساں نظر آئیں مگر آخرت میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اگر بفرضِ محال اس دنیا کے بعد کوئی اور دنیا نہ ہو اور یہاں کی عدالتوں سے ماوراء کوئی اور عدالت نہ ہو اور ظالم و مظلوم دونوں مر کر مٹی ہو جائیں اور ان کا کوئی اخروی حساب و کتاب نہ ہو تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ قدرت کے نظام میں کوئی قانونِ مکافات کارفرما نہیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ بات مشیتِ خداوندی اور قدرت کے نظامِ عدل دونوں کے سراسر خلاف ہے۔ اگر دنیا میں ظالم اپنے برے انجام سے بچ بھی جائے اور مظلوم کو انصاف نہ مل سکے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمیشہ ظالم و مظلوم کے ساتھ ایک جیسا معاملہ رہے گا، اور ان کے درمیان یکسانیت رہے گی، کیونکہ اس زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد اخروی دنیا میں ایک ایسی عدالت لگنے والی ہے جہاں کوئی مجرم اپنے جرم کی سزا پائے بغیر نہ رہے گا اور کسی نیکوکار کی بھلائی جزا پائے بغیر نہ رہے گی۔

لہٰذا قرآن بار بار خبردار کرتا ہے کہ موت انسانی زندگی کی انتہاء نہیں بلکہ یہ اگلی آنے والی زندگی کا دروازہ ہے۔ موت سے ایک زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو دوسری زندگی کا باب کُھل جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ارشادات نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح اچھے اور بُرے لوگ یکساں نہیں، اس طرح انسان کی موت و حیات بھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ اگر موت محض فنا ہو جانا ہوتا تو اس صورت میں وہ ہر ایک کے لئے یکساں ہوتی۔ لہذا موت میں وہ کونسا پہلو ہے جو نیک و بد کے انجام کے فرق کو قائم رکھتا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وہ پہلو جس میں دونوں کی موت ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز رہتی ہے حیاتِ بعد الموت ہے۔ نیک شخص کی موت یقیناً بدکار کی موت سے مختلف ہو گی، کیونکہ یہ موت دونوں صورتوں میں آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہے اور دونوں کی آئندہ زندگی بھی ایک

دوسرے سے مختلف ہوگی۔ اگر یہ خیال درست ہو کہ موت مکمل فنا کا نام ہے تو پھر قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اچھے اور برے لوگوں کی موتیں یکساں نہیں ہوسکتیں۔ لیکن قرآن ان دونوں کے درمیان جو تمیز پیدا کر رہا ہے وہ تبھی درست ہوسکتی ہے اگر یہ مانا جائے کہ مرنے کے بعد انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے اگلے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے جس کا نام آخرت ہے۔

20 ایمان بالآخرت اوراس کی حقیقت (۱)

ایمان کے پانچ بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم رکن ایمان بالآخرت (آخرت پر ایمان) کا عقیدہ ہے۔قرآن کریم میں ایمان بالآخرۃ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس انسانی زندگی پر اس عقیدے کے جو اثرات پڑتے ہیں، انہیں واضح کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اس تصور کو اجاگر کرنے کیلئے قرآنِ حکیم ایمان بالآخرت کی حقیقت کو یوں واضح کرتا ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتاً وفَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَO (البقرہ،۲:۲۸)	(کافرو) تم خدا کا کیونکر انکار کر سکتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں جان بخشی۔ پھر وہی تم کو مارتا ہے، پھر وہی تم کو زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیۂ مبارکہ کی یہ باتیں قابل غور ہیں:

۱۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتاً (تم مردہ تھے) مردہ ہونے کا ظاہری معنی یہ ہے کہ کوئی چیز موجود ہو کر مر جائے، مگر اس مقام پر انسانی زندگی کے وجود میں آنے سے پہلے کی حالت کو تشبیہاً موت قرار دیا جا رہا ہے۔ ۲۔ فَاَحْيَاكُمْ (پھر اس نے تم کو زندہ کر دیا) اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو نہ ہونے کی پہلی حالت سے نکال کر موجودہ حالت میں پہنچا دیا۔ ۳۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ (پھر وہ تمہیں دوبارہ مارے گا) اگرچہ یہ زندگی جو دوسری موت کے بعد انسان کو دی جائے گی، پہلی

زندگی سے بالکل مختلف ہوگی، مگر یہ بھی انسان کی آخری قرارگاہ نہ بننے پائے گی۔ ۵۔ ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنِ (پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) یعنی اس دوسری زندگی کے بعد انسان کو پھر دربارِ خداوندی میں حاضر کر دیا جائے گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ قرآن کریم شروع میں دو موتوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے ایک تو انسان کے سفرِ زندگی (شروع کرنے) سے پہلے کی حالت ہے جبکہ دوسری موت سے مراد وہ حقیقی موت ہے جس کا نظارہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ پھر جس طرح انسان پر دو موتیں وارد ہوتی ہیں، اسی طرح مرحلہ وار انسان کو دو زندگیوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں سے پہلی زندگی تو واضح ہے کہ اس سے مراد عالمِ شہادت کی موجودہ زندگی ہے۔ یہ روشنی، اندھیرے، ہونے اور نہ ہونے کی زندگی ہے۔ مگر دوسری زندگی سے مراد قیامت کی زندگی نہیں، بلکہ عالمِ برزخ یعنی مرنے سے لے کر قیامت تک کی زندگی ہے جس کے دوران منکر نکیر کے سوال و جواب ہوتے ہیں اور انسان عذابِ قبر سے دوچار ہوتا ہے یا رحمتِ خداوندی کا حقدار بنتا ہے۔ اس زندگی کا نام ''برزخ'' ہے جبکہ اُخروی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوگا جب اس زندگی اور اس مادی کائنات کو مکمل طور پر فنا کر دیا جائے گا۔ پھر سیدنا آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر قیامت کے واقع ہونے تک جتنے بھی انسان اس دنیا میں آئے ہوں گے، ان سب کو میدان حشر میں جمع کیا جائے گا اور ان کے سامنے عدالت الٰہیہ میں ان کے اعمال ناموں کا حساب و کتاب لیا جائے گا۔ جس کے نتیجے میں یا تو وہ ابدی جنت کے مستحق ہوں گے یا جہنم کے سزاوار ٹھہرائے جائیں گے۔ یہ آخری مرحلہ تین حصوں کا مجموعہ ہے۔ جو مختصراً اس طرح ہے

۱۔ مرنے کے بعد میت کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے پھر وقت آنے پر تمام انسانوں کو ان کی قبروں سے نئی زندگی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اس مرحلے کو بعث بعد الموت کہتے ہیں:

۲۔ دوسرے مرحلے میں قیامت کے دن اٹھنے کے بعد ہر شخص کو اس بات کا کامل شعور ہوگا کہ میں وہی شخص ہوں جو دنیوی زندگی میں فلاں اچھائی یا برائی کا مرتکب ہوا تھا۔ اس طرح اسے اپنی گزشتہ اور موجودہ شخصیت کے ایک ہونے کا پوری طرح احساس ہوگا۔ یعنی شعوری طور پر وہ یہ جانتا ہوگا کہ دنیا کی ندگی گزار کر وہ اس عالمِ آخرت میں پہنچا ہے۔

۳۔ انسان نے جو کچھ دنیا میں کیا ہوگا، اس کے لئے وہ جوابدہ ہوگا، اور اس کے مطابق جزا و سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ یہ ایمان بالآخرت کا تیسرا جزو ہے۔ ان تینوں اجزاء پر مکمل ایمان رکھنے کا نام ''ایمان بالآخرت'' ہے جو دنیاوی زندگی سے اخروی زندگی میں داخل ہونے کے ان تین مرحلوں سے عبارت ہے۔ جب تک کوئی مسلمان اس عقیدے کو اپنے ایمان کا حصہ نہ بنالے اس کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔

21 ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت (۲)

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ موت کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ایمان بالآخرت کا پہلا جزو ہے۔ تصورِ آخرت کے اس اہم جزو کا قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ذکر کیا گیا ہے:

۱. يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا (المجادلہ، ۶:۵۸)
وہ دن جب خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا۔

۲. اِنْ كُلُّ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا○ لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا○ (مریم، ۱۹:۹۳-۹۴)
جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کے سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔ اس نے سب کو گھیر رکھا ہے اور ایک ایک کو شمار کر رکھا ہے۔

۳. يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ۔ (الحج، ۲۲:۵)
اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو جان لو کہ ہم نے پہلے بھی مٹی جیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا ہے۔

اس کے بعد قرآن جو بیان کرتا ہے اس کا مطلب ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات اور نفس کی پوری پوری پہچان ہوگی۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ (المجادلہ،۵۸:۷)	پھر جو جو کام یہ کرتے رہے ہیں، قیامت کے دن وہ ایک ایک ان کو بتائے گا۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نہ صرف زندہ کرے گا بلکہ تمام انسانوں کو اس سے جو وہ دنیاوی زندگی میں کرتے رہے ہیں آ گاہ بھی کرے گا یعنی۔ انہیں بتایا جائے گا کہ انہوں نے کیا کمایا، کیا پایا اور کیا کھویا؟ یہ بھی بتایا جائے گا کہ ہر فرد نے یہ برائی کی ہے اور یہ اچھائی۔ اسطرح ان کی سابقہ زندگیوں میں صادر ہونے والی ہر اچھائی اور برائی کا احساس پیدا کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر دوبارہ زندگی کے بعد کسی فرد میں اپنی گزشتہ زندگی کا احساس نہ ہو، تو پھر جزا اور سزا کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے جزا اور سزا کا کوئی مفہوم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس فرد کے ذہن میں اس احساس کو بیدار کر دیا جائے جس کے نتیجے میں وہ جانتا ہو کہ میں نے ہی اپنی گزشتہ زندگی میں یہ جرم کیا تھا اور آج اسی کا یہ بدلہ دیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص خود کو پہچان رہا ہوگا۔ اس بارے میں قرآن نے جو فرمایا ملاحظہ فرمائیے۔

۱.هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ۔	وہاں ہر نفس اپنے ان اعمال کو خود جانچ لے گا جو وہ پہلے کر چکا ہے۔

(یونس،۱۰:۳۰)

نیز فرمایا:

۲.يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا مُّحْضَرًا وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ۔	وہ دن جب ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے اور اس برائی کو جو وہ کر چکا ہے، اپنے سامنے موجود پائے گا۔

(آل عمران،۳:۳۰)

٣.يَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَO

(النور،۲۴:۲۴)

اس دن ان پر خود ان کی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ اور پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے، جو وہ کرتے تھے۔

٤.حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوۡهَا شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَ اَبۡصَارُهُمۡ وَ جُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ O وَ قَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا قَالُوۡا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡ ... الاية

(حم السجدہ،۴۱:۲۰۔۲۱)

حتی کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان پر ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان اعمال کی گواہی دیں گی وہ جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ پھر وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی ہے وہ جواب دیں گی کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی عطا کی ہے جس نے ہر چیز کو بولنے کا ملکہ عطا فرمایا۔

مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے کھول کھول کر ان احوال سے انسان کو باخبر کر دیا ہے جو اسے اخروی زندگی میں پیش آئیں گے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد ایمان بالآخرت میں اسے کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔

22 ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت (۳)

ہم بیان کر رہے تھے جزا و سزا کا تصور اور اس کا احساس انسان کے ذہن میں اس وقت بیدار ہوگا جب گزشتہ زندگی اور اس کی تمام کارگزاری آئینے کی طرح اس کے سامنے ہوگی اور اسی لئے اسے احساس اور شعور کے ساتھ خدا کے سامنے حاضر کیا جائے گا تاکہ وہاں اس کے گناہوں کی سزا اور نیکیوں کی جزا دی جائے گی۔ قرآن مجید نے اس تصور کی وضاحت کرتے ارشاد فرمایا:

۱.وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔	بیشک تمہیں قیامت کے دن اپنی اس زندگی کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (آل عمران،۳:۱۸۵)
۲.ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَO	پھر ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (آل عمران،۳:۱۶۱)

یہاں ان الجھنوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں حشر کے دن اور موت کے بعد اٹھائے جانے سے متعلق پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر شخص کو مرنے کے بعد زمین میں دفن ہونا نصیب نہیں ہوتا، مثلاً کچھ لوگ ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ جہاز کو آگ لگ جاتی ہے اور افراد جل کر ختم ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کے ذرات بھی ہوا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سمندر میں ایک شخص سفر کر رہا ہوتا

ہے، دوران سفر ہی اس کو موت آ جاتی ہے اور لوگ اس کو کفن پہنا کر نماز، جنازہ ادا کرنے کے بعد اٹھا کر سمندر میں پھینک دیتے ہیں، جہاں اسے مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔ مچھلیوں کو شکاری پکڑ لاتے ہیں اور کھا جاتے ہیں۔ اور پھر وہ کھانے والے بھی مر جاتے ہیں۔ اسی طرح قبر میں مردے کو دفنانے کی صورت میں بھی یہ بات مسلم ہے کہ کچھ ہی برسوں میں مٹی انسانی جسم کو مکمل طور پر کھا جاتی ہے۔ اب وہاں نہ جسم ہے اور نہ جسم کے ذرات۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت میں اس کے ساتھ کیا ہوگا؟ کیسے اٹھایا اور زندہ کیا جائے گا؟ اور کیسے رب ذوالجلال کی عدالت میں حساب و کتاب کے لئے پیش کیا جائے گا؟ اسی نوعیت کے اعتراضات پچھلی امتوں کے کفار و مشرکین اپنے دور کے انبیاء سے کرتے تھے اور اہل عرب حضور اقدس سے بھی کیا کرتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے:

۱. وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًاطO

(بنی اسرائیل، ۴۹:۱۷)

اور انہی نے کہا کہ جب گل سڑ کر ہماری صرف ہڈیاں رہ جائی گی اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرنو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے۔

۲. ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذَالِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌO

(ق، ۳:۵۰)

کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر جی اٹھیں گے۔ زندی کی یہ واپسی بعید از عقل ہے۔

وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ۔

(السجدہ، ۱۰:۳۲)

اور انہوں نے کہا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو ہمیں پھر نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا۔

۳. وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیٰوتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرَ۔

(الجاثیہ، ۴۵:۲۴)

اور انہوں نے کہا کہ ہمیں دنیوی زندگی ہی کا سامنا کرنا ہے، کسی اور کا نہیں۔ ہم اس میں مرتے بھی ہیں اور جیتے بھی ہیں۔ اور ہماری موت کا باعث بھی صرف وقت اور زمانے کا طبعی نظام ہے۔

یاد رہے کہ موت کے بعد اٹھائے جانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بعینہ اسی بدن اور جسم کو دوبارہ انہیں ذرات اور خلیوں کے ساتھ زندہ کیا جائے جس سے اس کا دنیوی وجود بنایا گیا تھا۔ انسان کے موجودہ جسم کے ذرات اور خلیے سات سال کے اندر مکمل طور پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس مدت میں پرانے خلیے اندر ہی اندر پگھل کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں، جب کہ ان کی جگہ نئے خلیے اور نئے سیل لے لیتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان کی زندگی میں کئی مرتبہ (مثلاً ستر سال کی عمر میں کم از کم ۱۰ مرتبہ) یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر سال کے بعد اس کے پرانے جسم کی جگہ مکمل طور پر نیا جسم لے لیتا ہے۔ اگر دنیوی زندگی میں انسانی جسم کے بنیادی ذرات کے بار بار تبدیل ہوتے رہنے کے باوجود اس کی شخصیت وہی رہتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ آخرت میں اس انسان کا ڈھانچہ وجود میں نہ آ سکے؟ اس کی وجہ فقط انسان کا ''شعورِ عینیت'' ہے جس نے اسے اپنے نفس کے ادراک اور اپنی ذات کی شناخت پر قائم رکھا اور اس کے ظاہری بدن میں وسیع تر توڑ پھوڑ کے باوجود اس کی شخصیت بھی سلامت رہی۔

لہذا ثابت ہوا کہ انسان کی شخصیت حقیقت میں مادی ذرات کے اجتماع کا نام نہیں، بلکہ انسان کی شخصیت حقیقت میں اس شعور کا نتیجہ ہے، جو بدنی ذرات کے مکمل طور پر

بدل جانے کے باوجود اسے برقرار رکھتا ہے۔اس کی مثال اس طرح ہے۔فرض کیجئے آپ نہایت پرسکون کمرے میں چار پائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔آپ کو نیند آجاتی ہے اور آپ خواب میں دیکھتے ہیں کہ آپ نے کوئی جرم کیا ہے جس کی وجہ سے پولیس آپ کا تعاقب کر رہی ہے اور وہ بالآخر آپ کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر عدالت سے آپ کو کوڑوں کی سزا سنائی جا رہی ہے۔آپ کو کوڑے لگائے بھی جا رہے ہیں اور جیسے ہی کوڑا آپ کے جسم پر پڑتا ہے،آپ چیخنا چاہتے ہیں مگر آواز گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔جب زیادہ تکلیف ہوتی ہے تو ایک زوردار چیخ بلند ہوتی ہے اور آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔نہ آپ نے کوئی جرم کیا، نہ پولیس نے آپ کو پکڑا اور نہ سزا دی ہے۔لیکن جسم پر لرزے کی کیفیت طاری ہے اور نہ صرف رونگٹے کھڑے ہیں، بلکہ چیخ بھی فی الواقع آپ کے منہ سے نکل گئی ہے۔

23 ایمان بالآخرت اور اس کی حقیقت (۴)

ہم انسان کے حالتِ خواب کے مشاہدے کا ذکر کر رہے تھے۔ بالکل ایسا ہی معاملہ اس شخص کے ساتھ ہوگا جسے قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ اس کے جسم کے مادی ذرات کو بلا شبہ مٹی کھا گئی، اس کی ہڈیوں کو زمین نے ختم کر دیا اور اس کے جسمانی ذرات اور خلیوں میں سے کچھ نہ بچا، لیکن اس شخص کی روح تو باقی ہوتی ہے جو نہ فنا ہوتی ہے اور نہ اسے مٹی نگل سکتی ہے۔ گویا انسانی زندگی کا شعور اس کے جسم کی وجہ سے نہیں، اس کی روح کی وجہ سے باقی رہتا ہے۔

لہذا انسانی جسم کے گل سڑ جانے کے باوجود اس کی حقیقی شخصیت، ذاتی شعور اور اس کا احساس اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اور عالمِ برزخ میں اس کے بدن پر سزا و جزا کا جو عمل ہوتا ہے، وہ اس کے ظاہری جسم اور مادی خلیوں پر نہیں بلکہ اس کی حقیقت اور اصلی شخصیت پر ہوتا ہے جو روح کی وجہ سے مثالی جسم کی صورت میں موجود رہتی ہے۔ اسی طرح اگر جسم آگ میں جل کر راکھ ہو گیا ہو یا سمندر میں ختم ہو گیا ہو، تب بھی اصل شخصیت باقی رہتی ہے جو جزا و سزا کے لئے کافی ہے۔

لہذا قبر میں لٹایا گیا مادی جسم خواہ وہ آگ میں جل کر فنا ہوا ہو یا سمندر میں غرق ہو گیا ہو، یا جنگل کے شیروں اور چیتوں کے پیٹ میں چلا گیا ہو، اس کی اصلی اور حقیقی شخصیت ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ جوں کی توں رہتی ہے۔ اس لئے کہ انسانی روح اور اس کا باطنی وجود اپنی جگہ درست، صحیح و سالم اور ہر نقصان سے محفوظ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موت کے بعد

زندگی کا تعلق جسم کے خاکی ذرات کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی باطنی اور روحانی شخصیت کے ساتھ برقرار رہتا ہے۔

ہم اس استدلال سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان کا شعور ہی اس کے حشر ونشر کے عقیدے کی بنیاد ہے۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو سزا جزا کا پورا نظام بیکار اور ایمان بالآخرت کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے گر جاتی ہے۔ یہ بات صرف اخروی زندگی تک ہی محدود نہیں، خود ہماری موجودہ زندگی بھی اسی ''احساس'' کی محتاج ہے۔

اگر کسی شخص کو ایسا انجکشن لگا دیا جائے، جس سے اس میں موجود شعور اور احساس ذات اس طرح ختم ہو جائے کہ اس میں غمی یا خوشی کو محسوس کرنے کی قوت ہی ختم ہو کر رہ جائے تو اب آپ چاہے تو اس جسم کے حصوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، اس پر چھریوں سے وار کریں لیکن اس پر چیر پھاڑ کا اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کبھی آپ نے سوچا، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کاٹنے کے باوجود جسم کو اذیت محسوس نہ ہو؟ اس کی وجہ فقط یہ ہوتی ہے کہ انسانی جسم تو قائم رہتا ہے، مگر اس میں وہ شعور باقی نہیں جس سے تکلیف کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

انسانی زندگی حقیقت میں اس احساس اور شعور ہی کا نتیجہ ہے جس نے اس کے اندر تمام کیفیات کو زندہ رکھا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں یہ امر واضح کر دیا گیا کہ قیامت کے روز انسانی جسم کے اسی احساس کو بیدار کیا جائے گا۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا — پس وہ تم کو اچھی طرح آگاہ کر دے گا کہ تم کیا کام کرتے رہے ہو۔ (النور، ۲۴:۶۴)

یہ الفاظ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ قیامت کے روز اٹھائے جانے کا عمل جسم کے ساتھ نہیں بلکہ روح اور اس شعور کے ساتھ ہوگا جس سے انسان اپنے گذشتہ کئے اعمال کو

بھی دیکھ رہا ہوگا اور اس کی جزا وسزا کی فرحت و تکلیف بھی محسوس کر رہا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذات شعورِ عینیت کے ساتھ ساتھ انسان کو قبر میں اسی جسم کے ساتھ اٹھانے پر بھی قادر ہے جس جسم پر موت وارد ہوئی تھی۔ خواہ اس کا ایک ذرہ بھی ظاہرا باقی نہ رہا ہو۔ پھر بھی قیامت کے دن باری تعالی کی اسی قدرت کو سرِ عام دکھایا جائے گا۔ قرآن حکیم اس بات کو یوں واضح کرتا ہے:

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ۔	اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے پہلے بھی تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔
(الحج، ۲۲:۵)	

لہذا جو ذات انسان کی پہلی تخلیق مٹی سے کر سکتی ہے، وہ اس کی نشاۃ ثانیہ مٹی یا کسی اور چیز سے کیوں نہیں کر سکتی؟

24 ایمان بالقدر (۱)

ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم موضوع ''ایمان بالقدر'' ہے جو اجزائے ایمان کا آخری مگر انتہائی ضروری جزو ہے، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلہ کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس یہاں رک جاؤ، شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو اور اس سے آگے نہ سوچو۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پیچیدہ اور نازک مسئلے میں الجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں، لہٰذا اس موضوع پر بحث و تکرار میں حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہی ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۝ حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے۔ (الصفت، ۳۷:۹۶)

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر یاد رہے کہ لفظ ''تخلیق'' اور ''کسب'' کے معانی اور مقاصد مختلف اور جدا جدا ہیں۔ کسب کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں۔ جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے

والا) ہے، مگر انسان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ انسان اور اسکی تمام تر اشیاء واعمال مخلوق محض ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ دنیا کی ہر چیز کے خالق ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصورات رہ جاتے ہیں، اول خداوند تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصور اور دوم انسان اور اس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور نتیجتاً خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق یہی ہے۔

خدا اور اس کی ذات وصفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنی واعلیٰ چیز مخلوق ہے، اس لئے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال وافعال بھی مخلوق ہیں، جن کے مخلوق ہونے کے ناتے تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے، مگر کسب وارتکاب انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ اس لئے اب اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی اپنے افعال سے کیا نسبت ہوگی یہاں پر قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں، بلکہ ان کا کرنے والا یعنی مکتسب ومرتکب ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ	ہاں جو برے کام کرے اور اس کے گناہ
خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ	ہر طرف سے اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○	دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ اس
(البقرہ،۲:۸۱)	میں ہمیشہ رہیں گے۔

قرآنِ کریم یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوقِ خدا ہے، لیکن اس کا ہر فعل انسان کا اپنا کسب ہے اور کسب چونکہ آزادانہ ہے اس لئے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیونکہ، جزا وسزا کا تعلق کسبِ اعمال سے ہے نہ کہ خلق اعمال سے۔ اسی بناء پر سورۃ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًاO	اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔
(الملک، ۶۷:۲)	

موت وحیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں، مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے، ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا نتیجہ ہے۔ زندگی، اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالمِ آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا گویا دنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض وغایت اسلئے ہے کہ یہ دیکھا جاسکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون برے۔ اسی تصور کو قرآنِ کریم دوسری جگہ اس طرح واضح کرتا ہے:

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ۔	اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔
(الشوریٰ، ۴۲:۳۰)	

لہٰذا اگر انسان کو کوئی بھی نعمت ملتی ہے تو اس میں خدا تعالیٰ کا لطف وکرم شامل ہوتا ہے، مگر مصیبت واقع ہونے میں انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے لیکن بندگی کا ادب جس کی تعلیم انسان کو دی گئی ہے یہی ہے کہ وہ اپنے اعمال کو نیک بنانے کی کوشش کرتا رہے۔ لیکن وہ یہ جان لے کہ اسے اس راہ میں جن مشکلات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں۔

25 ایمان بالقدر (۲)

یہ ایک نہایت نازک اور حساس معاملہ ہے تاہم اس کو ہم آسان ترین کر کے پیش کرنے کی کوشش کریں گے، ایمان بالقدر کے باب میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتًا ایسا مختار ہے کہ اس پر کوئی روک ٹوک ہی نہ ہو اور نہ ایسا مجبور کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت دونوں کے بین بین ہے جو ایک معتدل کیفیت کی مظہر ہے۔ حقیقت میں اسے اختیار اور ارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی یہ آزادی ایک حد تک ہے۔

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے مسلۂ جبر و قدر کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے سوال کرنے والے سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ، اس نے اٹھالی، پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھاؤ، اس نے عرض کیا: یہ تو ناممکن ہے، فرمایا کہ پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی اور دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے یعنی اس کا اپنا توازن اسے اختیار کی ایک خاص حد سے آگے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اس تصور کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کشمکش پیدا ہوتی ہے یعنی اس کا فرض اور اس کی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال سے متعلق ہوتا ہے ۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے، ان کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسے افعال پر گرفت ہوتی ہے ۔عملاً اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ میں سوئی چبھونا چاہےاوراس کے خوف سے آپ کی پلکیں اضطراری طور پر بند ہو جائیں تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابلِ مواخذہ نہیں، لیکن اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی کو بری نظر سے دیکھنے کے فعلِ ناحق کے لئے حرکت کریں،تو یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پر گرفت ہوگی ۔حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔

سب سے پہلے ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے ۔مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی اور دوسری طرف خدا کے حکمِ نہی کا بھی خیال آ گیا۔ابتدائی سوچ کے اس مرحلے کو ’’کشمکش کا مرحلہ‘‘ کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد غور وخوض کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج یعنی فوائد ونقصانات کا جائزہ لیتا ہے، وہ خدائی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی ۔اس طرح فعل کا ذہنی وجود کشمکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غور وخوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمکش اور غور وخوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی کی مجبوری اور پابندی کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے اور پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی اپنائے یا برائی کو، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر اور فرض کی پیروی کرے یا خواہشِ

نفس کی، اسی ذہنی فیصلے کو ''نیت'' بھی کہتے ہیں۔اب جہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے، آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیے کہ کیا ان تینوں مرحلوں میں کس نے انسان کو مجبور کیا؟ کیا اس پر خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور وخوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا؟ ہرگز نہیں۔آپ نے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے دیکھا اور پرکھا، بے شک ایک کشمکش اور ذہنی تصادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچنے کے عمل میں انسان مکمل طور پر آزاد ہے۔

اس کے بعد عزم وارادے کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ذہنی طور پر کمر باندھ لیتے ہیں، یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیش نظر رہے کہ نیت، ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمربستہ ہوجانے کا نام ہے۔گویا ارادہ، نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے، نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ موخر، لہٰذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔ ایمان بالقدر پر طویل بحث ذہنی انتشار کا باعث بنے گی بس اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض معاملوں میں انسان کو مجبور اور بعض میں مختار بنایا ہے اور وہی اچھی اور بری تقدیر کا خالق ہے۔

26 قضاوقدر (تقدیر) اورانسانی زندگی (۱)

اب ہم قضا وقدر یعنی تقدیر کے بارے چند بنیادی باتیں اپنے قارئین کو بتانا چاہیں گے کہ ''قدر'' کا لفظی معنی اندازہ کرنا، وزن کرنا، طے کرنا، اور مقرر کرنا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ إِمَامٍ مُّبِيْنٍO

اور ہر چیز کو ہم نے کتابِ روشن یعنی لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔

(یٰسین، ۳۶:۱۲)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ O فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍO

(یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے، لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا۔

(البروج، ۸۵:۲۱-۲۲)

اس طرح اور بھی بہت سی قرآنی آیات ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات اور بنی نوع انسان کے احوال وکوائف کا علم خدا تعالیٰ کے پاس موجود ہے، جسے اس نے ''ام الکتاب'' یا ''لوحِ محفوظ'' میں حفاظت سے لکھا ہوا ہے اور ''کل شئی'' کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ بھی ایسا نہیں جس کا علم اسے نہ ہو۔

بہت سی احادیث میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا:

کتب اللہ المقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموات والارض بخمسین الف سنه قال و عرشه علی الماء۔	اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں، جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔

(صحیح مسلم، ۲: ۳۳۵، کتاب القدر رقم: ۲۶۵۳)

افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس قسم کی آیات اور احادیث کا جو مفہوم عوام میں پایا جاتا ہے، وہ قرآن وحدیث سے بالکل الٹ ہے۔ عوام کے بعض حلقوں نے ان روایات سے یہ مراد لے لیا ہے کہ مسئلہ تقدیر کا مفہوم انسانوں کی بے بسی اور مکمل مجبوری ہے۔ عوام کے خیال میں تقدیر کے ذریعے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مجبور کر دیا ہے، اور وہ ایک قدم بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کے لئے اچھائی اور برائی تخلیق کر کے اسے اس میں سے کسی ایک کو اپنے لئے چن لینے کا اختیار یعنی قدرت عطا فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو نیکی کو اختیار کرے اور چاہے تو بدی کو اپنا لے۔ چنانچہ سورہ البلد میں ہے:

اَلَم نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِO وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ O وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِO (البلد، ۹۰: ۸ تا ۱۰)	بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے) (یہ چیزیں بھی دیں) اور اس کو (خیر و شر) دونوں کے راستے بھی دکھا دیئے۔

دوسرے لفظوں میں خداوند کریم نے جس قدر ظاہری اور باطنی صلاحیتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں، ان سب کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی صلاحیتوں کو راہِ خیر میں صرف کر کے کمال کے مرتبہ کو پہنچ جائے اور چاہے تو اپنی ان قوتوں کو بدی کے بیج بونے

اوراس کی فصل کاٹنے کے لئے وقف کردے۔اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پرفرمایا:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ دین اسلام میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت صاف طور پرظاہراورگمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ (البقرہ،۲:۲۵۶)

مزید وضاحت کرتے ہوئے اس سلسلے میں سرورِکائناتﷺ کی پیغمبرانہ ذمہ داری کے بارے میں ارشاد ہوا:

مَاعَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ۔ پیغمبرﷺ کے ذمے بس خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ (المائدہ،۵:۹۹)

انبیاءکرام علیھم السلام بھی اپنی قوموں کونصیحت کرنے کے بعدفرماتے تھے:

وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۝ اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہےاوربس۔ (یٰسین،۳۶:۱۷)

اوپر بیان کردہ آیات کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبروں کی ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ وہ اپنی اپنی امتوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچادیں اب خدائی حکم کے پہنچنے کے بعد یہ کام متعلقہ افراد کا ہے کہ وہ چاہیں تو انبیاء کی باتوں پرکان دھرتے ہیں یانہیں دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ نیکی اور بدی میں سے جس کو چاہیں اپنالیں۔

27 قضاوقدر (تقدیر) اور انسانی زندگی (۲)

تقدیر کے باب میں نیکی اور بدی کا تصور واضح کرتے ہوئے رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

جب کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کے دل پر نور کا ایک نقطہ ثبت ہو جاتا ہے اور اگر وہ نیکیاں کرتا چلا جائے تو اس کا دل نور علی النور بن جاتا ہے۔ پھر اس کی نیکی کا اثر اس کے چہرے پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اسکے برعکس اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے اور اس پر خدا کے سامنے نادم ہو کر توبہ نہیں کرتا تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے۔ اب اگر وہ شخص توبہ کر لے تو یہ نقطہ مٹا دیا جاتا ہے۔ توبہ نہ کرے بلکہ دوسرا گناہ کر لے، پھر تیسرا اور اسی طرح گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے تو ہر گناہ کے بدلے اس کے دل پر ایک ایک نقطہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، یہاں تک اس کے دل کی دنیا سیاہ بادلوں کی طرح تاریک ہو جاتی ہے اور اس میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

اصولِ قضا کے تحت یہ سب کچھ ہوتا اور بار بار دہرایا جاتا ہے، مگر قانونِ قدر کے تحت نافرمان بندوں کو قبولِ حق کے اختیار کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے حق کی دعوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں کے بند دریچوں کو کھولنے اور ان کے دلوں اور ذہنوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے کی کوشش جاری رکھی جاتی ہے، ان پر توبہ و استغفار کے دروازے بھی کھلے رکھے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ حکمِ قدر کے تحت ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔

عملی زندگی میں اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص بے احتیاطی کر کے اور خراب اور ناقص غذائیں کھا کر اپنا معدہ مکمل طور پر خراب کر لے اور جب جسمانی کمزوری اور ضعف حد سے بڑھنے لگے تو اپنی بیماری کا صحیح طریقے سے علاج کرنے کے بجائے ثقیل، مرغن اور قوت بخش غذاؤں کا استعمال شروع کر دے تو نتیجہ کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ایسی طاقت ور غذائیں اس شخص کو مزید بیمار کر دیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خوراک میں کچھ کمی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس کے معدے میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔

اسی طرح ایک شخص برائی کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ پھر اس راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اب اگر دل کے بیمار اور مردہ ہو جانے کی وجہ سے اس میں قبولِ حق کی صلاحیت نہیں رہی اور اس پر کسی اعلیٰ سے اعلیٰ نصیحت کا بھی اثر نہیں ہوتا تو اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ''میرا مقدر ہی خراب تھا''۔ اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرے، جہاں سے اصل بگاڑ اور فساد شروع ہوا ہے اور جس بگاڑ کے ہوتے ہوئے اس پر تمام وعظ و نصیحت بے اثر ہو جاتی ہے۔

قضا و قدر کے یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ ان میں ''قدر'' کا تعلق بندے کے اختیار اور فعل سے ہے جبکہ ''قضا'' کا تعلق خداوند تعالیٰ کے حکم کے نفاذ سے ہے۔ ان میں ترتیب یہ ہے کہ قدر ہمیشہ پہلے اور قضا بعد میں ہوتی ہے۔

اردو میں ''قدر'' کا لفظ اندازے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ ''یہ چیز اس قدر کافی ہے'' یا ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات ''اس قدر درست ہے اور اس قدر غلط'' پس قدر سے مراد اردو میں ایک خاص اندازہ اور مقدار ہوتی ہے جبکہ قضا کا مفہوم فیصلہ کرنا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو کسی حادثے یا واقعے کا اس کے ہونے سے پہلے کیسے پتا چل جاتا ہے، انہیں کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کائنات کے خالق نے جو نظام پیدا کیا ہے اس میں ہر پیش آنے والے واقعے کا کوئی نہ کوئی سبب یا علت رکھی ہے، اس کو وہ لوگ جو کائنات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں کسی نہ کسی حد تک جان لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کی ٹھیک ٹھیک گھڑیوں تک کا جان لینا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی تمام پیشین گوئیاں اس کے تحت آتی ہیں اور لوگ واقعات کے وقوع سے پہلے محض علت اور سبب جان کر ان کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ موسمیات کے ماہرین آئندہ آنے والے موسمی حالات کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

اس سے پتا چلا کہ مستقبل کے حالات و واقعات ہر ایک کے لئے مخفی نہیں۔ کوئی آنکھ ایسی بھی ہوتی ہے جس کے سامنے ہر واقعہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ وہ ذات جس کے سامنے کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل کھلی کتاب کی طرح ہے خود باری تعالیٰ ہے، وہ جسے چاہے ایک حد تک آنے والے کسی واقعے سے باخبر کر دیتا ہے اس کا اختیار اس کے سوا اور کسی کو نہیں کیونکہ وہی علیم اور خبیر بھی ہے اور قادر مطلق بھی۔

28 قضاءوقدر(تقدیر)اورانسانی زندگی (۳)

قضا و قدر کے موضوع پر علماء نے طویل بحث کی ہے مگر مولانا رومؒ نے اس موضوع پر دو بڑی نفیس حکایات پیش کی ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک چور کوشاہی پیادے پکڑ کر کوتوال کے پاس لائے اور بتایا کہ ''اس شخص کو ہم نے چوری کرتے ہوئے موقع پر گرفتار کیا ہے۔کوتوال نے چور سے پوچھا کیا،تو نے چوری کی ہے؟اس نے جواب دیا''ہاں'' لیکن میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا۔تو جانتا ہے کہ کائنات ایک ذرہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہے۔یہ سن کر کوتوال نے پیادوں سے کہا کہ ''اسے درخت سے الٹا لٹکا کر اتنا مارو کہ کھانا پینا سب بھول جائے۔یہ حکم سن کر چور نے گڑگڑانا اور رونا شروع کر دیا تو کوتوال نے کہا:اب کیوں روتا ہے؟یہ کام بھی میں خدا کے حکم ہی سے کر رہا ہوں۔

دوسری حکایت کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص بغیر کسی اجازت کے باغ میں گھسا اور درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔اتنے میں باغ کا مالک ادھر آ نکلا اور اس شخص کو پھل توڑتے دیکھ کر بولا:''ارے او بے حیا!یہ کیا حرکت ہے؟'' پھل توڑنے والے نے جواب دیا:''اگر اللہ کا بندہ اللہ کی پیدا کئے ہوئے پھل توڑ کر کھائے تو اس میں بے حیائی کی کون سی بات ہے؟خدائے بے نیاز کی نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھنے والا تو کون ہوتا ہے؟'' یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا:ذرا مضبوط رسی اور کوڑا لے آؤ تا کہ میں اللہ کے اس بندے کو جواب دوں۔غلام دوڑا دوڑا گیا اور دونوں چیزیں لا کر پیش کر دیں۔بعدازاں باغ کے مالک نے چور کو اسی درخت سے باندھا اور اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر

دیئے۔ چور نے کہا: ارے بھائی کچھ تو خدا کا خوف کرو کیا مجھے مار ڈالنے کا ارادہ ہے۔ تو اس نے جواب دیا: ''چیخو مت! اللہ کی پیدا کی ہوئی لکڑی سے اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو مار رہا ہے۔'' آخر اس چور نے اپنے عقیدے سے توبہ کی اور زبانِ حال سے اس بات کا اقرار کیا کہ بے شک انسان کو قوتِ اختیار حاصل ہے۔ خواہ وہ اچھائی کرے یا برائی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت ارشاد فرمایا:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ۔	اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

(الانعام،۶:۵۹)

''الغیب'' چھپی ہوئی حقیقتوں کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے مخفی امور کا علم خدا کے پاس ہے۔ تعالیٰ کی ذات کائنات بننے سے پہلے موجود تھی۔ اس نے انسانوں اور کائنات کو پیدا کیا، پھر انسانوں کو اپنے عمل کا مکمل اختیار عطا فرما دیا، انسانوں نے اپنے اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اچھے اور برے کام کیے، کسی نے قتل کیا، کسی نے لوٹ مار مچائی، کسی نے بھلائی کی، کسی نے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کئے۔ لڑائیاں لڑیں، ملک فتح کئے، زمین کو سنوارا، شہر آباد کئے، چھوٹی بڑی بستیاں آباد کیں۔ ان اعمال کے مختلف نتائج پیدا ہوئے۔ اللہ وند تعالیٰ چونکہ ''مفاتیح الغیب'' کا مالک ہے، اس لئے انسانوں کو متوقع آزادی دیے جانے کے جو نتائج وقوع پذیر ہونے تھے، وہ اسے پہلے سے معلوم تھے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ علم کسی شخص کو اچھے یا برے کام پر مجبور نہیں کرتا۔

سورہ الرعد میں ارشاد فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ	خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس

اُمُّ الْكِتَابِO   کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور لوح محفوظ
اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ (الرعد،۱۳:۳۹)

ام الکتاب سے مراد ''لوحِ محفوظ'' ہے۔ جہاں وہ تمام کام جو ہو چکے یا ہونے والے ہیں ان کے احوال کا اندراج ہوتا ہے، جو علمِ الٰہی کا دوسرا نام ہے۔لہٰذا اس آیۂ مبارکہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اندازے میں تبدیلی کرتا رہتا ہے اور موقع بہ موقع اس میں ردوبدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ گویا انسان خود کو بدل لے یا بدلنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کی خاطر اپنے اندازے اور اپنی مقررہ کردہ تقدیر میں تبدیلی فرما دیتا ہے۔

تقدیر قطعاً ایسے مسئلے کا نام نہیں جس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔ وہ تو محض انسانی اچھائی یا برائی کا ایسا علم ہے، جس میں موقع و محل کی نسبت سے تبدیلی ممکن ہے، بشرطیکہ انسان اس تبدیلی پر مائل ہو۔

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ملک شام میں طاعون کی وبا پھیلی اور اس زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شام گئے ہوئے تھے۔ وباء کی وجہ سے انہوں نے وہاں سے نکلنے میں جلدی سے کی۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اتفر من قضاء الله   کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟

حضرت عمرؓ نے اس کا جو جواب دیا وہ تقدیر کے مسئلے کی تمام گتھیاں سلجھا دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

افر من قضاء الله الى قدر الله۔   میں اللہ کی قضا سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ قضا تو فیصلے کا صرف اعلان ہے۔ اگر طاعون جیسا مہلک مرض کسی علاقے میں وبا کی صورت میں پھیل جائے اور میں کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر اس مرض سے بچ جاؤں تو میرا بچ جانا یقیناً خدا کی تقدیر یعنی علم میں ہوگا۔

29 ملائکہ (فرشتوں) پر ایمان

عام انسان ملائکہ کو ان کی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ انسانی آنکھ صرف کثیف اور مادی اجسام ہی کو دیکھ سکتی ہے، غیر مادی اور لطیف اشیاء کو نہیں۔ مگر وہ عرفاء کاملین جنہوں نے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعے اپنی باطنی آنکھ روشن کر لی ہوتی ہے اور ان کی آنکھ سے مادی پردے اٹھ چکے ہوتے ہیں، وہ نہ صرف ملائکہ کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ انہیں ان سے ملاقات اور اکتسابِ فیض کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے۔

فرشتوں کے نہ دیکھے جانے کے باعث بعض کم علم لوگوں نے ان کے خارجی وجود ہی کا انکار کر دیا ہے اور چونکہ قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر فرشتوں کا ذکر آیا ہے، اس لئے ان آیاتِ قرآنی کی تاویل کرتے ہوئے وہ فرشتوں کو غیر محسوس مجرّد قوتوں، نیک انسانی روحوں یا صفات باری تعالیٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سب تصورات گمراہی پر مبنی ہیں اور گمراہ ذہنوں اختراع کی پیداوار ہیں۔

قرآن مجید کی بیسیوں آیات اور احادیثِ نبوی سے فرشتوں کے جس تصور کی تائید ہوتی ہے وہ وہی ہے جس کو جمہور اہلِ اسلام شروع سے آج تک مانتے چلے آرہے ہیں۔ فرشتے انسانی روحیں، قوتیں یا صفات الٰہیہ ہرگز نہیں بلکہ انسانوں اور جنوں سے الگ زمین و آسمان پر رہنے والی ایک مستقل نوع کی لطیف مخلوق ہیں۔ انہیں باری تعالیٰ نے اپنے خصوصی امور کی انجام دہی اور احکام کی بجا آوری کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ گویا یہ ذاتِ حق کے وہ کارکن ہیں جن سے پیدائشی طور پر نافرمانی اور گناہ صادر ہو ہی نہیں

ہوسکتا۔ ان میں اپنی تخلیق کے اعتبار سے ہی شر و فساد اور فتنہ و ظلم کی طاقت اور صلاحیت ہی نہیں، اس لئے روزِ قیامت ان سے جواب دہی اور کسی قسم کا حساب کتاب نہیں ہوگا۔ بعض جاہلوں نے انہیں غلطی سے خدا کی بیٹیاں تصور کیا، بعض نے ان کے کام کی نوعیت کے پیش نظر انہیں خدائی میں شریک بنا دیا جب کہ بعض نے ان کی پرستش بھی کی۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر ان تمام تصورات کو باطل قرار دیا، جو وہ فرشتوں کے بارے میں رکھتے ہیں اسی بیان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا۔	اور انہوں نے ان فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اس کی بیٹیاں بنا دیا۔

(الزخرف، ۴۳:۱۹)

اور ان کی حقیقت کے بارے میں یوں وضاحت کی گئی ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَO	بلکہ وہ فرشتے خدا کے معزز بندے ہیں۔

(الانبیاء، ۲۱:۲۶)

قرآنِ حکیم نے فرشتوں کا صبح و شام کا وظیفہ یہ بیان کیا ہے:

۱۔ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَO	فرشتے دن رات خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور ہرگز نہیں تھکتے۔

(الانبیاء، ۲۱:۲۰)

۲۔ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ۔	اور تم فرشتوں کو عرش کے اردگرد اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کرتے دیکھو گے۔

(الزمر، ۳۹:۷۵)

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ○ (الانبیاء،۲۱:۲۷)

فرشتے خدا سے بات کرنے میں پیش قدمی نہیں کرتے اور وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔

یعنی فرشتوں سے کام لینا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے پر منحصر ہے اور جہاں باری تعالیٰ چاہتا ہے ان کے ذریعے اپنے مقبول بندوں اور دوستوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ جنگِ بدر میں فرشتوں نے مسلح ہو کر مجاہدینِ اسلام کی مدد کی۔

ارشادِ قرآنی ہے:

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ○ (آل عمران،۳:۱۲۵)

تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا۔

ان تمام آیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرشتوں کو بحیثیت مخلوق باقاعدہ وجود اور تشخص حاصل ہے۔ وہ مستقل ہستیاں ہیں، مجرد قوتیں یا نظام عالم کے اسباب نہیں ہیں جیسا کہ بعض بے خبر اور نادان پسند لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے بلا جواز انہیں سائنسی تحقیق کا موضوع بنالیا ہے۔

30 تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان ضروری ہے

اسلام نے کسی خاص نبی کی کتاب پر ایمان لانے کی بجائے تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل کی گئی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ O

(البقرہ،۲:۱۳۶)

مسلمانو! کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری، اس پر اور جو صحیفے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے، ان پر اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو عطا ہوئیں ان پر، اور جو دیگر پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں، ان سب پر ایمان لائے۔ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی پر ایمان لانے میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدائے واحد کے فرمانبردار ہیں۔

یہاں قرآن مجید نے دوٹوک الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ آدم علیہ

السلام سے لے کر حضور سرورِ کائنات ﷺ کی بعثت مبارکہ تک جتنے بھی انبیاء کرام علیھم السلام تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کی طرف بذریعہ وحی اپنے پیغامات بھیجے ہیں، ان پر ایمان لانا از حد ضروری ہے، ان میں سے بعض کو کتابوں اور بعض کو صحیفوں کی صورت میں نازل کیا گیا۔ ان میں سے بعض مشہور ہیں اور ان کے نام قرآن مجید میں بھی لئے گئے ہیں، جب کہ بعض غیر معروف ہیں اور ان کے نام بھی مذکور نہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کتاب اور صحیفے پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ نفسِ وحی میں ذرہ برابر بھی فرق نہ کیا جائے۔

اس آیت سے ایک اور اہم اصول کا پتا چلتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کتابی ہدایت بغیر کسی امتیاز کے ہر ایک نبی پر نازل کی ہے۔ البتہ معروف اصطلاح میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر نبی صاحب کتاب نہیں تھا، کیونکہ انبیاء علیھم السلام کی تعداد تو ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش ہے۔

انبیاء علھیم السلام میں سے چند نفوس ایسے ہیں، جن پر کتاب یا صحیفہ نازل ہوا۔ امام بیہقیؒ نے حضرت حسن بصریؒ سے روایت کیا ہے کہ ''کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار (۱۰۴) کتابیں نازل فرمائی ہیں''۔ (الاتقان، ۲:۱۲۶)

اسی بناء پر نبی اور رسول میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ نبی تو ہر وہ پیغمبر ہے جسے شرفِ نبوت سے سرفراز کیا گیا ہو، جب کہ رسول اسے کہتے ہیں کہ جسے نبوت کے بعد منصب رسالت پر بھی سرفراز کیا گیا ہو اور اسے کسی مخصوص قوم کی طرف دعوت و تبلیغ کا با قاعدہ پیغام اور پروگرام دے کر بھیجا گیا ہو۔ اس لحاظ سے ہر رسول نبی تو ہوتا ہے، لیکن ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ لہذا انبیاء کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر رسولوں کی کم۔

اگر چہ بہت سے رسولوں کو صحائف عطا کئے گئے مگر جن کو با قاعدہ کتابیں عطا کی

گئیں، ان کی تعداد چار ہے۔ ان میں ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جنہیں تورات دی گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کو منصب نبوت پر فائز کر کے ان پر آسمانی کتاب زبور نازل کی گئی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل فرمائی گئی جس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ O وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ.

(المائدہ، ۵:۴۶، ۴۷)

اور ہم نے ان (حضرت عیسیٰ) کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ وہ تورات کی، جو اس سے پہلی (کتاب) ہے، تصدیق کرتی ہے اور ہدایت نصیب ہے پرہیز گاروں کے لئے اور انجیل والوں کو چاہیے کہ جو احکام خدا نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں اور جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکومت نہیں کرتے، وہ لوگ نافرمان (فاسق) ہیں۔

سب سے آخری نبی اور رسول جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنہیں صحیفۂ انقلاب قرآن مجید عطا کیا گیا۔ اب جس طرح تمام انبیاء کرام میں سے منصبِ رسالت پر فائز ہونے والے ''تمام رسول'' برگزیدہ ہیں اور رسولوں میں سے یہ چار صاحبِ کتاب ہستیاں عظیم المرتبہ ہیں اور ان چاروں رسولوں میں حضور فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس

مرتبے اور درجے کے اعتبار سے سب سے افضل اور بلند ہے، بالکل اسی طرح تمام انبیاء پر نازل شدہ صحائف میں سے چار کتب سب سے افضل ہیں اور ان چاروں کتابوں میں قرآن مجید کا مقام سب سے بلند و برتر ہے۔ جس کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ:

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ. (الشعراء، ۲۶:۱۹۶)

اور اس کا ذکر پہلے تمام پیغمبروں کی کتابوں اور صحیفوں میں موجود ہے۔

31 ایمان اور اِستقامت

خدائے ذوالجلال پر ایمان لانے کے بعد زندگی کی ہر آزمائش اور امتحان میں سے اس طرح ثابت قدمی کے ساتھ گزر جانا کہ پاؤں ڈگمگانے نہ پائیں، استقامت کہلاتا ہے۔اور یہی ایمان کا اعلیٰ وارفع درجہ ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَO نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ، وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَO نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍO

(حم سجدہ، ۴۱: ۳۰ تا ۳۲)

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول پر پختگی سے قائم رہے۔ ان پر فرشتے اترتے ہیں، اور انہیں کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، تمہیں جنت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی۔ تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم مانگو گے یہ میزبانی ہے بہت بخشنے والے ہمیشہ رحم فرمانے والے کی طرف سے۔

اوپر بیان کی گئی آیاتِ مقدسہ کے الفاظ ہمیں غور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں اور بات اللہ کو رب کہنے سے شروع کی جا رہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے اللہ کے رب ہونے کے اقرار اور دل کی گہرائیوں سے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے بعد ضروری ہے کہ اس کی ربوبیت پر ایمان میں ثابت قدمی کا عملی مظاہرہ کیا جائے۔ اللہ کو رب ماننا اپنے اندر تین معانی رکھتا ہے۔ جس کی وضاحت سورۂ عصر میں کچھ یوں موجود ہے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ یعنی زمانے کی قسم ہے جو انسان کے احوال و معاملات پر گواہ ہے۔ انسان اپنے آپ کو چاہے جتنا چھپانے کی کوشش کرے مگر زمانے کی آنکھ سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے۔ زمانے کی قسم کھا کر فرمایا کہ انسان اپنے عمل، اپنی کوتاہ بینی اور عاقبت نا اندیشی کے باعث مسلسل نقصان اور خسارے میں جا رہا ہے۔ ''الا الذین اٰمنوا'' سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے زبان سے ایمان کا اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کی، ''وعملوا الصلحت'' اور صرف زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کو ہی کافی نہ جانا بلکہ ایمان کی عملی شہادت اللہ کے احکام کی اطاعت کے ذریعے دی اور عملی زندگی میں برائیوں کو ترک کر کے نیک کام کئے، یعنی وہ عملِ صالح پرہیزگاری اور تقویٰ کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر اوامر و نواہی کی پابندی کرتے رہے۔ ''وتواصوا بالحق'' اور پھر اعمالِ صالحہ پر ہی قناعت نہ کی بلکہ معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہوئے حق کا ساتھ دیا اور جب کبھی حق و باطل میں تصادم اور آویزش کا مرحلہ آیا تو ہمیشہ حق کی عملی معاونت کی اور باطل کے خلاف محاذ آرا ہو گئے۔ گھریلو زندگی میں کاروبار اور تجارتی معاملات میں بھی غرضیکہ ہر دنیاوی مصروفیت میں اللہ کے ہر حکم کو مقدم جانا، خوشی، غمی، تنگی ترشی، فراخی و وسعت اور ازدواجی زندگی، معاشرتی، اقتصادی اور معاشتی زندگی، ثقافتی، مذہبی، سیاسی اور تمدنی زندگی کے دوران حق کا جو معیار قائم کر لیا اس کو ہر وقت پیشِ نظر رکھا۔ اور زندگی کے کسی موڑ پر اس

سے کبھی انحراف نہ کیا یہاں تک کہ کاروبار اور تجارت میں مادی منفعت پر خدا اور رسول کی رضا کو ترجیح دی اور لین دین کرتے وقت بھی یہی بات مدنظر رکھی، دوسروں کے ساتھ دوستی اور دشمنی کے معاملات میں بھی ان کی زندگی ''الحب للہ و البغض للہ'' کا عملی نمونہ بنی رہی۔ یعنی وہ اللہ کے لئے ہی محبت، دوستی اور دشمنی کرتے رہے۔ ''وتواصوا بالصبر'' جب آزمائش ومصیبت کی گھڑیاں آتی ہیں صبر سے کام لیتے ہیں، آہ بکاء نہیں کرتے بلکہ نہایت تحمل اور بردباری سے ہر مشکل اور کٹھن مرحلے کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتے ہیں اور ان کے ثابت اور پکے قدم کبھی نہیں ڈگمگاتے۔

اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کے ان صالح اور برگزیدہ بندوں کے ساتھ اپنا مقابلہ کریں اور جائزہ لیں تو ہم پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ذرا سے فائدے اور مصلحت کی خاطر اللہ کے احکام کو ٹھکرا کر گزر جانا ہمارا شیوہ بن گیا ہے۔ نفسانی خواہشات اور دنیاوی مفادات کے سامنے ہم خدا اور رسول کی خوشنودی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ اگر ایک راہ خدا کی طرف جاتی ہے اور دوسری رسم ورواج کی طرف تو ہم دوسری راہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں سے اتباع اور اطاعت کا وہ اعلیٰ معیار چاہتا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد انسان اپنی گردن کو اللہ اور رسول ﷺ کے آگے اس طرح جھکا دے کہ اس کے قدم زندگی کے کسی موڑ پر صراطِ مستقیم سے ڈگمانے نہ پائیں۔

32 استقامت کی جانچ اور پرکھ کے لئے پانچ قرآنی اصول

قرآن مجید نے ایمان لانے کے بعد استقامت یعنی ایمان پر ثابت قدم رہنے پر بہت زور دیا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَO	اور ہم تمہیں کچھ ضرور آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور تمہاری مالوں اور جانوں اور پھلوں میں کمی کرنے سے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنائیے۔

(البقرہ،۲:۱۵۵)

غور سے دیکھا جائے تو ایمان اور آزمائش دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دوسرے لفظوں میں ایمان اور امتحان لازم وملزوم ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی ایمان میں داخل ہو اور اس کے ایمان کو آزمائش سے پرکھا نہ جائے۔ اس آیہ کریمہ میں آزمائش کی پانچ قسموں کا ذکر کیا گیا ہے جو ایمان کی استقامت ہی کو پرکھنے کے لئے ہیں۔

ا۔خوف: خوف زندگی کے ساتھ سائے کی طرح پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی جان جانے کا خوف، یعنی ہر وقت ہلاکت کا دھڑ کا لگا رہنا، کبھی مال و دولت چھن جانے کا خوف اور کبھی یہ ڈر کہ اولاد ہاتھوں سے نکل جائے گی، یا ان کے مستقبل کا کیا بنے گا؟ ہماری عزت وآبرو کیسے محفوظ رہے گی؟ اس طرح کے واہمے اور اندیشے رات

دن پیچھا کرتے رہتے ہیں مگر اس حالت میں بھی دیکھنا یہ ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق اور لگاؤ کیسا ہے اور ہم اپنے رب کو کس طرح مانتے ہیں؟ ایسی ہر حالت میں اگر ہمارا تعلق اللہ کے ساتھ قائم و دائم رہا تو ہم بحمد اللہ اس امتحان میں پورے اتریں گے، اور یہ امتحان زندگی کے آخری سانس تک درپیش رہے گا۔

۲۔ بھوک : بھوک، غربت اور افلاس سے ہمیں دوچار کیا جائے گا۔ اور باوجود محنت مشقت کے تم فقر و فاقہ کی زندگی پر مجبور کئے جائیں گے، یہ اس لئے نہیں کہ معاذ اللہ خدا کو تمہاری ضروریات کا علم نہیں یا اسے تم سے کوئی عداوت ہے بلکہ اس کا مقصد صرف ہمیں آزمانا ہے کہ ہم اس حال میں بھی اللہ کے ساتھ اپنا تعلق اور ناطہ کس طرح قائم رکھتے ہیں؟

۳۔ مال و دولت اور دنیاوی نعمتوں سے محرومی : آزمائش و امتحان کے طور پر ہمیں مال و دولت، مادی آسائشوں اور نعمتوں سے نواز کر اس سے محروم کر دیا جائے گا۔ مقصود اس سے یہ آزمانا ہوگا کہ خوشحالی اور محرومی دونوں حالتوں میں ہماری ایمان کی کیفیت کیا رہتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مال و دولت چھن جانے کے بعد ہم خدا کی ربوبیت کا انکار کر کے غیر اللہ کی طرف رجوع کرنے لگیں ہو اور اس کی ہستی سے اپنا تعلق ہی توڑ لیں۔

۴۔ ہلاکت اور جانی نقصان : کبھی جانیں ضائع ہونے اور اموات واقع ہونے کی صورت میں ہمیں آزمائش و امتحان میں ڈالا جائے گا۔ کیا موت سامنے دیکھ کر زندگی کی تمنا کرتے ہو یا اپنے خالق و مولا سے ملاقات کی آرزو رکھتے ہو؟

۵۔ نعمتِ اولاد سے محرومی : اور آخری آزمائش جس سے ہمارا امتحان لیا جائے گا وہ یہ کہ کبھی ہمیں اولاد دے کر آزمایا جائے گا، کبھی اولاد سے نواز کر اسے واپس لے لیا جائے گا۔ کبھی بیٹیاں دیں گے اور بیٹے عطا نہیں کریں گے اور کبھی بیٹیوں سے محروم رکھ کر بیٹے ہی

عطا کئے جائیں گے۔

جب بندہ استقامت کے بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے اور نعمت ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں صبر و شکر اور ذکر کو اپنا وظیفہ بنالیتا ہے تو اس پر اللہ تعالی کی نوازشات کی بارش ہونے لگتی ہے۔ پھر فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ میرے اس شکر گزار بندے پر نازل ہو جاؤ جس نے مصیبت اور خوشی، مال و دولت کی فراوانی اور محرومی ہر حال میں مجھے یاد رکھا اور میری یاد اور شکر کے دامن کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ پھر اذنِ الٰہی سے فرشتے دنیا میں اترتے ہیں اور خوش خبری کی ندائیں دیتے ہوئے اس اللہ کے محبوب و مقرب بندے کو اپنی امان میں لے لیتے ہیں۔ اس مقام پر دنیا و آخرت کے سارے خوف اس سے اٹھالئے جاتے ہیں اور انہیں جنت کی خوشخبری سے نوازا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالے اپنے مقبول بندوں کو ”ولاتحزنوا“ کہہ کر خطاب کرتا ہے۔

33 استقامتِ ایمان پر ایک حکایت

اللہ تعالیٰ ایمان پر استقامت کے نتیجے میں اپنے بندوں پر اپنی رحمتیں اور برکتیں کس طرح نچھاور کرتا ہے اس کی ایک مثال ایک واقعہ کے حوالے سے درج کی جاری ہے جسے امام جلال الدین سیوطیؒ نے نقل کیا ہے۔

ملک شام میں تین صالح نوجوان بھائی رہتے تھے۔اوران دنوں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگ ہورہی تھی۔اسے دیکھ کران کے دل میں جہاد کا شوق پیدا ہوااور وہ اسلامی لشکر سے جاملے۔روم کی سرحد پرعیسائیوں کی بہت بڑی فوج مسلمانوں پرحملہ آور ہونے کے لئے تلی بیٹھی تھی۔رات کے وقت جنگ شروع ہوئی تو یہ تینوں نوجوان دیوانہ وار جہاد میں مصروف ہوگئے۔جنگ ختم ہوگئی لیکن یہ جانباز جواللہ کی راہ میں جان قربان کرنے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلے تھے، دشمن کے ہتھے چڑھ گئے۔عیسائی انہیں گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے اس نے کہا کہ ان کی جان بخشی کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اسلام ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کرلیں ورنہ انہیں ابلتے تیل کے کڑاہوں میں پھینک دیا جائے گا۔وہ کہنے لگے کہ تو جو چاہیے کرلے ہمیں ایک لمحہ بھی اسلام چھوڑنا گوارا نہیں، کیونکہ شہادت کی موت ہماری نظر میں حسنِ مطلق کے جلوؤں کے مشاہدے کی گھڑی ہے۔

بادشاہ کے حکم سے بڑے بھائی کو جلتی آگ پر تپتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں ڈال دیا گیا۔اس نوجوان نے یا محمداہ ﷺ کہہ کر موت کو قبول کیا اور شہادت سے پہلے اپنے دونوں بھائیوں کو تلقین کی کہ دیکھنا کہیں تمہارے قدم لڑکھڑانے نہ پائیں،تمہارے اور میرے درمیان چند لمحات کا وقفہ ہے، میں جنت کے دروازے پر تمہارا انتظار کروں گا۔تھوڑی دیر بعد

دوسرے بھائی کو بھی تیل میں پھینک دیا گیا، تیسرے سے کہا گیا کہ دیکھ لو اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو تمہارا ابھی یہی حشر ہونے والا ہے۔اب بھی وقت ہے عیسائیت قبول کرلو۔وہ کہنے لگا: ظالمو تم باتوں میں خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ مجھے بھی جیسے چاہو موت کی نذر کردو۔ وہ تیسرے بھائی کو بھی جلتے تیل میں جھونکنے والے ہی تھے کہ بادشاہ کے وزیر نے درخواست کی کہ مجھے چالیس دن کی مہلت دو میں اس عرصہ کے دوران اسے عیسائی بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ بادشاہ نے وہ نوجوان اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں اپنا وزیر اعظم بنانے کا وعدہ کرتا ہوں۔وزیر اس جوان کو ہمراہ لے کر اپنے محل پہنچا۔رات اس نے اپنی حسین و جمیل بیٹی کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا کہ بیٹی اس مسلمان نوجوان کو عیسائی بنانے کا مشن تیرے سپرد کر رہا ہوں۔صرف چالیس دن کی مہلت میں یہ کام سرانجام دینا ہے۔ کہنے لگی: ''ابا جان یہ مہلت تو بہت زیادہ ہے میں تو تھوڑے ہی عرصے میں اس کو رام کرلوں گی۔''

وہ حسینہ بہترین لباس زیب تن کر کے آرائش و زیبائش حسن کے ساتھ ناز و ادا دکھلاتی ہوئی اس کمرہ میں داخل ہوئی جہاں وہ نوجوان رکھا گیا تھا، اس نے دیکھا کہ وہ نوجوان سجدے کی حالت میں رب کے حضور گڑ گڑا رہا ہے اور اس نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ حسینہ ساری رات اس کا سر سجدے سے نہ اٹھا سکی۔دوسری رات بھی وہ اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کی پلکیں ایک بار بھی اس کی جانب نہ اٹھیں۔تیسرے دن وہ شام ہوتے ہی اس کے قریب آ گئی اور اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ ابھی حالت نماز میں داخل نہیں ہوا تھا، لیکن اسے دیکھتے ہیں اس نوجوان نے نماز کی نیت کر لی۔اس طرح چالیس دن گزر گئے، مہلت اور بڑھا دی گئی لیکن اسی راتیں بیت جانے کے بعد بھی اس جوان کی حالت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ وہی استغراق، محویت اور تڑپنے پھڑکنے کی کیفیت برقرار

رہی۔آخر جب وہ حسین دوشیزہ اس کو اپنی طرف مائل نہ کر سکی تو وہ جو شکار کرنے آئی تھی خود شکار ہوگئی۔ بے اختیار اس کے قدموں پر گر گئی اور کہنے لگی ’’تجھے تیرے رب کی قسم جس کی محبت میں تو روز و شب اسیر ہے مجھے بھی کلمہ پڑھا کر مسلمان بنا دے‘‘۔ جوان نے بغیر اس کی طرف نگاہ اٹھائے اسے کلمہ پڑھا دیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس شہزادی نے اپنے غلام سے کہہ کر دو گھوڑے منگوائے اور رات کے پچھلے پہر محل سے نکل پڑے اور سلطنتِ روم کی حدود سے باہر جانے کے لئے ایک جنگل کا رخ کر لیا۔ آگے آگے وہ جوان اور پیچھے وہ نو مسلم دوشیزہ، دونوں عیسائیوں کی زد سے بچ نکلنے کے لئے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شہزادی کا دل دہل گیا اور وہ گھوڑا روکتے ہوئے کہنے لگی: جوان! معلوم ہوتا ہے انہیں ہمارے فرار کی خبر ہوگئی ہے۔ اس نے کہا: گھبراؤ نہیں۔ اتنے میں وہ گھوڑ سوار قریب آ گئے۔ نوجوان نے تلوار سونت کر کہا: اگر تم میں کوئی دشمن ہے تو اس کا سر اسی تلوار سے قلم کر دیا جائے گا۔

جب وہ انتہائی قریب آ گئے تو انہیں سفید لباس میں ملبوس فوج نظر آئی جس کے آگے دو نقاب پوش گھڑ سوار تھے، جب انہوں نے اپنا نقاب پلٹا تو وہ دونوں اس جوان کے شہید بھائی نکلے، وہ دونوں گھوڑے سے اترے اور چھوٹے بھائی سے بغل گیر ہو گئے۔ اس نے استفسار کیا: بھائی جان آپ دونوں تو میرے سامنے شہید ہو گئے تھے آپ یہاں کیسے؟ انہوں نے کہا کہ ہم دونوں جنت کے دروازے پر تمہارے منتظر تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پیارے جوانو! آج تمہارا بھائی امتحان میں کامیاب و سرخرو ہو کر کافروں کے حلقے سے بچ کر نکلا آ رہا ہے۔ تم دونوں فرشتوں اور شہیدوں کی روحوں کے جلوس میں جاؤ ان کا استقبال کرو اور ان دونوں کا نکاح کرا دو اور انہیں میری غلامی میں آ جانے کا مژدہ سنا دو۔ چنانچہ ہم سب یہاں اس مقصد کے لئے تمہارے پاس آئے ہیں۔

34 ختمِ نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی (۱)

قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کے خاتم النبین ہونے کا اعلان یوں فرمایا گیا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا○

محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، ہاں اللہ کے رُسول اور سلسلۂ انبیاء کو ختم کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

(الاحزاب،۳۳: ۴۰)

اس ارشادِ ربانی میں لفظ خاتم کا جو معنی بیان ہوا ہے، حضور ﷺ کی متعدد اور متواتر احادیث سے وہی معنی و مفہوم متعین ہوتا ہے اور اجماعِ اُمت کا بغیر کسی شک و شبہ کے اُسی پر اتفاق ہے۔

حضور خاتم الانبیاء ﷺ نے اپنی کئی احادیث مبارکہ میں اس بات کو واضح فرمایا ہے کہ ''خاتم النبین'' کا معنی آخری نبی ہی ہے، چنانچہ بہت سی احادیث متصل سند کے ساتھ ختمِ نبوت کے اُسی تصور کو اُجاگر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں چند روایات درج کی جاتی ہیں، جو اس موضوع پر قولِ فصیل کا درجہ رکھتی ہیں۔

۱۔قال كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبيآء كلما هلك نَبِيٌّ خلفه' نبی و انه لَا نبی بعدی

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی راہنمائی انبیاء کرتے تھے، جب ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی اُس کا جانشین ہوتا،

وسیکون خلفاء.

(صحیح البخاری،۱:۴۹۱،کتاب الانبیاء،رقم حدیث:۳۲۸)

خبردار میرے بعد کوئی نبی نہیں خلفاء ہوں گے۔

۲ ـقال ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنٰی بَیۡتًا فاحسنه واجمله الا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون به یتعجبون له و یقولون هلا وضعت هذه اللبنه فانا اللبنة وانا خاتم النبیین.

(صحیح البخاری،۱:۵۰۱،کتاب المناقب،رقم حدیث:۳۳۴۲)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایک ایسے شخص کی طرح ہے، جس نے ایک گھر تعمیر کیا اور اُسے بہت خوبصورت اور عمدہ بنا دیا، لیکن ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ رہنے دی۔ لوگ اس گھر کے گرد چکر لگاتے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے اور کہتے یہ خشت کیوں نہیں لگائی گئی؟ پس میں ہی یہ خشت ہوں اور میں ہی آخری نبی ہوں۔

۳ ـقال رسول الله ﷺ ان الرسالةَ والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی.

(جامع الترمذی،۲:۵۱،ابواب الرؤیا،رقم حدیث:۲۲۷۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ، بے شک رسالت اور نبوت ختم ہو چکی ہیں، اس لئے میرے بعد کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔

٤ ـقال رسول الله ﷺ لا نبوة بعدی الا المبشرات قیل وما المبشرات یا رسول الله قال

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میرے بعد کوئی نبوت نہیں مگر مبشرات ہیں۔عرض کیا گیا یارسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟

الرؤيا الحسنة او قال الرؤ يا الصالحة.

(مسند احمد بن حنبل،۵:۴۵۴)

فرمایا اچھے خواب یا فرمایا نیک خواب۔

۵.قال النبیﷺ لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب.

(جامع الترمذی،۲:۲۰۹،ابواب المناقب،رقم حدیث:۳۶۸۶)

ارشاد فرمایا نبیﷺ نے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتا۔

٦۔قال رسول اللہﷺ لِعَلِیٍّ انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انّه لا نبی بعدی.

(جامع الترمذی،۲:۲۱۴،ابواب المناقب،رقم حدیث:۳۷۳۰)

نبی اکرمﷺ نے حضرت علی سے ارشاد فرمایا، تم میرے لیے ایسے ہو جیسے ہارون، موسیٰ کے لئے تھے، البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

۷۔قال رسول اللہﷺ لا نبی بعدی ولا اُمّة بعد اُمّتِی.

(بیہقی،جلد۵،ص۱۹۷)

نبی اکرمﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری اُمت کے بعد کوئی اُمت نہیں۔

لانبی بعدی ولا امة بعدکم

(کنزالعمال،رقم:۴۳۶۳۸)

میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔

۸۔بأبی انت اُمِّی (یا رسول اللہ) لقد انقطع بموتك مالم ینقطع بموت غیرك مِن النبوة

مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضورﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قُربان ہوں،

والابناء واخبار السّماء.

(نہج البلاغۃ،۲:۲۵۵)

آپ کی موت نے وہ چیز ختم کر دی جو آپ کے سوا کسی دوسرے کی موت سے ختم نہ ہوئی یعنی نبوت، غیبی خبریں اور آسمان کی وحی۔

۹۔ عن ابی جعفر و ابی عبداللہ رضی اللہ عنہم لقد ختم اللہ بکتا بکم الکتب وختم بینکم الانبیاء.

(اُصول کافی جلد۱،ص۱۶۳)(طبع نولکشور)

ابوجعفر اور ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہا۔ تحقیق اللہ نے تمہاری کتاب پر الہامی کتابوں کو ختم کر دیا اور تمہارے نبی حضرت محمد پر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا۔

35 ختمِ نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی (۲)

اسی طرح تمام مشہور اور معتبر مفسرین کرام نے مذکورہ آیت کی شرح میں ''خاتم'' کے معنی آخری نبی یعنی سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے ہی کے لئے ہیں۔ ہم یہاں چند اہم تفسیروں کا حوالہ دے رہے ہیں۔

۱۔ علامہ ابن جریر طبری (۲۲۴۔۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر طبری جلد ۲۲ صفحہ ۱۲ پر زیرِ بحث آیت کی تشریح یوں کرتے ہیں:

''اس نے نبوت ختم کر دی اور اس پر مہر لگا دی۔ اب یہ دروازہ قیامت تک کسی کے لئے نہیں کُھلے گا۔

۲۔ علامہ ابن خرم اندلسی (۳۸۴۔۴۵۶ھ) فرماتے ہیں:

''بلاشبہ حضرت محمد ﷺ کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لئے کہ وحی کا نزول صرف نبی پر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔ (المحلیٰ، ۱:۲۶)

۳۔ علامہ زمخشری (۴۶۷۔۵۳۸ھ) فرماتے ہیں:

''اگر آپ یہ سوال کریں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے آخری زمانے میں دوبارہ نازل ہوں گے تو پھر رسول اللہ ﷺ آخری نبی کیسے ہوئے؟ اس کے جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس معنی میں آخری نبی ہیں کہ آپ کے بعد کوئی اور نبی کی حیثیت سے مبعوث نہ ہو گا، رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ تو وہ ان انبیاء میں سے جنہیں حضور ﷺ سے پہلے نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ وہ جب دوبارہ آئیں گے تو حضور ﷺ کی شریعت کے پیرو ہوں گے اور اسی قبلے کی طرف رُخ کر کے

نمازیں ادا کریں گے، جس طرف اُمت کے دوسرے افراد اکرتے ہیں۔(الکشاف،۲:۲۱۵)

۴۔ امام جلال الدین سیوطیؒ (۹۱۱ھ) اپنی مشہور کتاب ''جلالین'' کے صفحہ ۷۶۸ پر لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ آپ ﷺ ہی کی شریعت کے پیروکار ہوں گے۔

اس طرح اور بہت سے علمائے تفسیر نے جن میں امام فخر الدین رازیؒ، علامہ شہرستانیؒ، علامہ بیضاویؒ، علامہ حافظ الدین نسفیؒ، علامہ علاؤالدین بغدادیؒ، علامہ ابنِ کثیرؒ اور علامہ شیخ اسماعیل حقیؒ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں ان سب نے خاتم النبیین کے اسی معنی کی توثیق کی ہے اور یہی اہلِ سُنت کا عقیدہ بھی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اس پر تمام اُمت کا اجماع ہے کہ اب جو شخص کہے کہ نبی ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی ہے وہ کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے ایمان کے ایک بنیادی جُز کا انکار کیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتابوں میں مختلف مقامات پر اپنے الہامات بیان کرتے ہوئے اپنی مختلف حیثیتوں کا جو ذکر کیا ہے وہ اُن کی ذہنی پراگندگی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ اتنے مضحکہ خیز ہیں کہ اُنہیں پڑھ کر ہوش وحواس رکھنے والا انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ وہ بیک وقت کبھی عیسیٰؑ وموسیٰؑ بنتے ہیں، کبھی آدم علیہ السلام ونوح علیہ السلام اور کبھی ابراہیم علیہ السلام ومحمد ﷺ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کہیں خدا کی بیوی یا بیٹا بن جاتے ہیں۔ کبھی انہیں حیض کی شکایت ہوجاتی ہے۔ کبھی حضرت مریم علیہا السلام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی ابنِ مریم علیہ السلام کی۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ ایک عام شخص بھی اس قدر ذہنی ودماغی انتشار کا شکار نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ ایک نبی۔

مرزا غلام احمد تضادات کا مجموعہ تھے۔ جب وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک کر گمراہی کی

دلدل میں دھنس گئے تو نبوت کے دعوے کرتے ہوئے بے سروپا اور بے تکی باتوں پر اُتر آئے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ مراق اور مالیخولیا جیسی خطرناک ذہنی بیماریوں کے مریض تھے۔

آخر میں ہم اس عجیب وغریب قادیانی ''نبی'' کی ایک تحریر کا حوالہ دے رہے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ

''اس وحیِ الٰہی میں خدا نے میرا نام رُسل رکھا، کیونکہ جیسا براہین احمدیہ میں لکھا گیا ہے۔ خُدا تعالیٰ نے مجھے تمام انبیاء کا مظہر ٹھہرایا ہے اور تمام کے تمام میری طرف منسوب کئے ہیں۔ میں آدم علیہ السلام ہوں، میں شیث علیہ السلام ہوں، میں نوح علیہ السلام ہوں، میں ابراہیم علیہ السلام ہوں، میں اسحٰق علیہ السلام ہوں، میں اسمٰعیل علیہ السلام ہوں، یعقوب علیہ السلام ہوں، یوسف علیہ السلام ہوں، عیسیٰ علیہ السلام ہوں، داوٗد علیہ السلام ہوں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام کا مظہراتم ہوں، یعنی ظلی طور پر محمد اور احمد ہوں۔

(حاشیہ حقیقت الوحی، ص۷۲، مصنف غلام احمد قادیانی، مطبوعہ ربوہ، ۱۹۵۰)

مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے مجدّد ہونے کا دعویٰ کیا، پھر مہدی، مثیلِ مسیح اور مسیح موعود کا اور پھر خود کو نبوت کے اعلیٰ درجے پر فائز کرلیا، اور بالآخر تمام حدیں پار کرتے ہوئے خود کو (نعوذ باللہ) ظلی اور بروزی طور پر نبی ہونے کا دعویٰ کر دیا اور حضور سیدّ الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسری تک ہی محدود نہ رہے بلکہ بعض مقامات پر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی خود کو افضل قرار دے دیا۔

﴿بانیٔ تحریک منہاج القرآن پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے قادیانی ٹولے کے سربراہ مرزا طاہر احمد کے مباہلہ کے چیلنج کے جواب میں مینارِ پاکستان کے زیرِ سایہ منعقد ہونے والی کانفرنس میں مرزا طاہر احمد اور جملہ جماعتِ احمدیہ کے زعماء کو للکارا کہ وہ لاکھوں فرزندانِ توحید کی موجودگی میں حق و باطل کے معرکے کا سامنا کرے مگر قادیانی جماعت کے امام کو اپنے پیش رؤوں کی طرح اہلِ حق کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ لفظ مباہلہ کی غلط تعبیرات کے ذریعے یہ تاثر دینے لگا کہ مباہلہ کے لئے فریقین کا آمنے سامنے ہونا کوئی ضروری نہیں﴾

36 حقیقتِ شرک

شرک ایک عظیم گناہ اور ناقابل معافی جرم ہے۔شرک کا مطلب ہے اللہ کی ذات،صفات اور افعال میں کسی کو اس کا ہمسر بنانا۔اس کی کئی صورتیں ہیں،خواہ بتوں کو اللہ کا شریک بنایا جائے یا اس کے محبوب و مقرب بندوں کو۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ج وَ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًاO

(النساء،۴:۴۸)

بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم تر (جو گناہ بھی ہو) جس کے لئے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے زبردست گناہ کا بہتان باندھا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر شرک کو بہت بڑی گمراہی قرار دیا گیا ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا O

(النساء،۴:۱۱۶)

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ واقعی دور کی گمراہی میں بھٹک گیا۔

سورۃ آل عمران میں شرک کی اور صورت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ — (آل عمران،۳:۷۹)

پھر وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ

قرآن حکیم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ شرک کیا ہے؟ اور ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی سمجھ آ جائے گا کہ شرک کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ ساری نعمتیں انسان کو اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہیں اور وہ نعمتیں عطائی ہیں ذاتی نہیں تو یہ شرک نہیں بلکہ توحید ہی ہے اور تمام قدرت وطاقت کا مالک اللہ ہی ہے۔ اس نے اپنی حقیقتِ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا○ — بے شک اللہ ہر شے سے خوب آگاہ ہے۔

(الاحزاب،۳۳:۵۵)

مگر ایک اور مقام پر حضور ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًاط — اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول تم پر گواہ ہو

(البقرۃ،۲:۱۴۳)

دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھیں تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ نے لفظ شھید اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے اور اپنے حبیب ﷺ کے لئے بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اللہ کی صفت اور شان ذاتی ہے جبکہ حضور ﷺ کی یہ شان اور صفت عطائی ہے ذاتی نہیں۔ اب اگر کوئی آپ ﷺ کے لئے شھیدِ حقیقی ہونے کا عقیدہ رکھے تو یہ شرک ہوگا کیونکہ یہ صرف اللہ کی شان ہے اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ آپ ﷺ کی یہ شان آپ کو بارگاہِ الٰہی سے ملی ہے تو یہ شرک نہیں بلکہ عین توحید ہے۔

اسی طرح یہ نکتہ بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات اور تمام جہانوں کے لئے رحمت ہے کہ اگر اس کی رحمت نہ ہو تو کوئی شئے وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔ جبکہ اللہ

تعالیٰ نے حضور ﷺ کی شانِ رحمت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ○

اور (اے رسول محتشم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت۔ (الانبیاء، ۲۱:۱۰۷)

اب یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تمام جہانوں کے لئے رحمت ہے اور حضور ﷺ بھی تمام جہانوں کے لئے رحمت، تو کیا یہ شرک ہو گیا؟ (معاذ اللہ) ہرگز نہیں اس لئے کہ اللہ کی شانِ رحمت ذاتی ہے جبکہ آپ ﷺ کی یہ شان عطائی ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ آپ ﷺ کی صفتِ رحمت ذاتی ہے تو یہ شرک ہوگا۔

اسی طرح اللہ نے اپنی نسبت ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ○

بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت فرمانے والا مہربان ہے۔ (البقرہ، ۲:۱۴۳)

جبکہ حضور نبی اکرم ﷺ کی نسبت باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ○

(وہ) مومنوں لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔ (التوبہ، ۹:۱۲۸)

دونوں میں رؤف اور رحیم ہونے کی صفت پائی جاتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ اللہ کی صفت ذاتی ہے جبکہ حضور ﷺ کی یہ صفت عطائی ہے۔

پس شرک کے لئے لازم ہے کہ آپ جس چیز کو شرک کہہ رہے ہیں سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ توحید کے کس اعتقاد اور کس شان سے متعلق ہے جس کی وجہ سے اس کا غیر کے لئے ثابت کرنا شرک ہے۔ اس لئے ضروری ہوگا کہ پہلے توحید کی حقیقت معلوم کی

جائے اور یہ جانا جائے کہ اللہ کے لئے کیا ثابت ہے؟ اور کس طرح ثابت ہے؟ جب ایک بار یہ طے ہوجائے کہ یہ صفات، اقوال اور خصوصیات اللہ کے لئے خاص ہیں تو اس چیز کو غیر کے لئے ثابت کرنا شرک ہوگا۔ اسی قاعدے کے تحت کسی بھی غیر کو شریک ٹھہرانے سے منع فرمایا گیا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○

پس تم اللہ کے لئے شریک نہ ٹھہرا ؤ حالانکہ تم (حقیقت حال) جانتے ہو۔

(البقرہ،۲:۲۲)

37 توسل کا بنیادی تصور (۱)

توسل یعنی وسیلے کا مسئلہ قرآن وسنت سے ثابت شدہ ہے۔ اس کے شرعی جواز سے انکار، آیاتِ قرآنی سے انکار کے برابر ہے جس کا کوئی صحیح العقیدہ مسلمان تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔ وسیلہ درحقیقت بندے کا اللہ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں اپنی دعا کی قبولیت اور حاجت برآری کے لئے اپنی عاجزی اور بے کسی کے اعتراف کے ساتھ کسی مقبول عمل یا مقرب بندے کا واسطہ پیش کرنا ہے تاکہ گنہگار بندے کی دعا جلد قبول ہو اور اللہ رب العزت اپنے اس مقرب بندے کی خاطر اس کی حاجت پوری فرمائے۔

کسی کو بطور وسیلہ پیش کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ مقبول ومقرب بندہ جس کا وسیلہ دیا جارہا ہے وہ بذات خود دعا قبول کرے گا، یا وہ اللہ کی ذات کو (معاذ اللہ) اس بات پر مجبور کردے گا کہ فلاں کام ہونا چاہئے یا فلاں بندے کی بخشش ومغفرت لازمًا کردی جائے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے۔ دراصل وسیلہ پیش کرتے وقت سائل کے ذہن میں یہ تصور ہوتا ہے کہ جب میں اپنی عاجزی، بےبسی اور نیاز مندی کا اظہار کرکے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد اس کے کسی مقبول اور مقرب بندے کا نام بطور وسیلہ پیش کروں گا تو اللہ تعالیٰ اپنے اس اطاعت گزار مقبول اور مقرب بندے کا حیاء فرماتے ہوئے ضرور میری حاجت پوری فرمائے گا۔ یہ تصور بھی وسیلہ کرنے والے کے ذہن میں ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ وہ صالح بندہ (معاذ اللہ) خدائی میں شریک ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ توسُّل کی حقیقت کو سمجھا جائے اور درج ذیل باتوں کو ذہن میں رکھا جائے۔

۱۔ سب سے اہم بات جو ذہن نشین کرنی ضروری ہے وہ یہ کہ وسیلہ کرنا محض دعا کے

طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے اور اس میں مقصودِ حقیقی صرف اللہ رب العزت کی ذات ہے جس کے حضور وسیلہ پیش کیا جا رہا ہے، جبکہ وہ شخص جس کو بطور وسیلہ پیش کیا جانا مقصود ہے اس کی حیثیت محض ایک واسطہ کی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اسی تعلق اور قربِ خاص کی وجہ سے اللہ جل مجدہٗ قبولیتِ دعا کے باب میں اس کا لحاظ اور حیاء کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری بات جو ذہن میں رہنی چاہئے یہ ہے کہ وہ بندہ جس کو کوئی اپنا وسیلہ بناتا ہے اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس مقرب بندے سے بے حد محبت ہوتی ہے اور وہ بھی اللہ کو اپنا محبوب رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ محض اللہ کے لئے کسی سے محبت رکھنا بذاتِ خود عمل صالحہ ہے۔ یہی بات وسیلے کی بنیاد ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں اور درست عقیدہ بھی یہی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے علاوہ عقیدہ رکھتا ہے تو وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ وہ بذاتِ خود اللہ جل شانہ کی طرح نفع ونقصان کا مالک ہے تو وہ شخص اس گمراہ کن عقیدے کے باعث ایمان سے خارج ہو جائے گا۔

۳۔ قبولیتِ دعا کے بارے میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دعا قبول کرنا محض وسیلے ہی پر موقوف ہے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَإِنِّیْ قَرِیْبٌ۔	اور (اے حبیب!) جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں تو (بتا دیا کریں کہ) میں نزدیک ہوں۔
(البقرہ، ۲:۱۸۶)	

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط أَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْأَسْمَآءُ	فرما دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جس نام سے بھی پکارتے ہو، (سب)

الْحُسْنٰی ج (الاسراء،۱۷:۱۱۰) اچھے نام اسی کے ہیں۔

لٰہذا اگر کسی کے ذہن میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وسیلہ جبر و اکراہ کا نام ہے تو وہ اب دور ہو جانی چاہیئے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جو شخص وسیلہ بنتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو اس امر پر مجبور کر دے گا کہ وہ متعلقہ فرد کے بارے میں مانگی جانے والی دعا کو ضُر ورشرفِ قبولیت سے نوازے۔ ہمارے نزدیک اس چیز کا وسیلے سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ محض اللہ جل شانہ کا انعام و اکرام اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے اپنے بعض صالح بندوں کو اپنی محبت' اطاعت اور فرمانبرداری کی وجہ سے یہ مقام عطا فرمایا کہ ان کے وسیلہ سے گناہ گار خطا کار اور عاجز و مسکین بندوں کو اپنی دعاؤں کی قبولیت کی زیادہ امید لگ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ ان نیک صالح بندوں سے منسوب چیزوں کی بھی حیا کرتا ہے۔ اسی لئے متبرک مقامات اور اشیاء کا وسیلہ بھی اسے پیش کیا جاتا ہے تاکہ دعا کی قبولیت کی امید اور بڑھ جائے۔

جمہور اہلِ اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اعمالِ صالحہ یعنی صوم وصلوۃ اور حج و زکٰوۃ، تلاوتِ قرآن اور دیگر اعمال کو وسیلہ بنانا جائز ہے۔ اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ البتہ توسُّل بغیرِ عمل جیسے 'توسُّل بالنبی ﷺ'، 'توسُّل بالصالحین'، 'توسُّل بالاولیاء' اور 'توسُّل بالآثار' کا بعض لوگ انکار کرتے ہیں جبکہ انسان کسی بھی شخص کو صرف اس کی محبت کی وجہ سے وسیلہ بناتا ہے۔ کیونکہ یہ وسیلہ بنانے والا اس کے بارے میں حسنِ ظن کی بنا پر ہی اس کی بزرگی و فضیلت پر اعتقاد رکھتا ہے یا پھر یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ پاک اس شخص سے محبت کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ (اللہ) ان سے محبت فرماتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔ (المائدہ،۵:۵۴)

38 توسل کا بنیادی تصور (۲)

بعض لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے حضور نبی اکرم ﷺ کے وسیلے سے دعا مانگتے ہوئے ہچکچاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وسیلے سے دعا مانگنا عقیدے کے رو سے صحیح نہیں اور یہ کہ جو مانگنا ہے براہِ راست اللہ سے مانگنا چاہیے۔ وہ قرآن مجید کی ان آیات کو حوالہ کے طور پر پیش کرتے ہیں جن میں کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائے جانے کا حکم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان آیات کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرنا (معاذ اللہ) کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کے برابر ہے۔ یہ تصور ہی دراصل بہت بڑی نادانی اور جہالت کی پیداوار ہے۔ ہمیں اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ انبیاء علیھم السلام یا اللہ تعالیٰ کے کسی صالح بندے اور کسی صالح عمل کو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہوئے وسیلے کے طور پر پیش کرنا نہ تو کسی قسم کا شرک ہے اور نہ ہی اللہ سے براہِ راست مانگنے کے خلاف عمل ہے۔

کسی کو وسیلہ بنانے کے باوجود صحیح عقیدہ یہی ہے کہ مانگا اللہ ہی سے جاتا ہے نہ کہ صاحبِ وسیلہ سے۔ شرک کا ارتکاب تو تب ہوگا جب اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی اور کو اللہ تعالیٰ کی طرح نفع ونقصان کا مالک، قادرِ مطلق اور دعائیں سننے اور قبول کرنے والا سمجھا جائے اگر یہاں سرے سے ایسا معاملہ ہی نہیں۔ دعا فقط اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاتی ہے اور اس سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہوئے حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس یا کسی ایسے مقرب بندے یا نیک عمل کا واسطہ دیا جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہو اور جس کا وہ عام مخلوق سے کہیں بڑھ کر حیاء اور لحاظ فرماتا ہو۔ سو ایسا وسیلہ پیش کرنے سے جہاں کلماتِ دعا کی

برکت اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے وہاں اس کی بارگاہِ عالی میں شرفِ قبولیت پانے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ اب اس بندے کی التجا کے ساتھ اللہ کے اس بندے کی اللہ کے ساتھ محبت بھی شامل ہو جاتی ہے، جس کا وسیلہ دیا جا رہا ہے ۔ یہ بہر حال ذہن میں رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاؤں کی قبولیت کے لئے وسیلہ شرط نہیں مگر مفید اور کارگر ضرور ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو اپنے وسیلہ سے دعا مانگنے کی تعلیم فرمائی تھی جیسا کہ ایک صحیح حدیث جس کے راوی حضرت عثمان بن حنیف ؓ ہیں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے انہیں دعا کے کلمات تلقین فرمائے تھے۔ محدثین کی کثیر تعداد نے اسے روایت کیا ہے۔ وہ کمات یہ ہیں۔

''اے اللہ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اور تیری طرف حضرت محمد ﷺ نبی رحمت کے وسیلے سے متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمد! میں آپ کے وسیلہ سے اپنی اس حاجت میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تا کہ وہ پوری ہو جائے ۔ اے اللہ ! میرے حق میں آپ ﷺ کی شفاعت قبول فرما۔

(المستدرک للحاکم، ا:۲۷۔۵۲۶) (مسند احمد بن حنبل، ۴:۱۳۸)

وسیلے کا جائز ہونا خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی ثابت ہے جس میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس علیہ السلام کے وسیلے سے بارش کی دعا مانگنے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ جب مدینہ منورہ میں سخت قحط پڑ گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر اہلِ مدینہ کو حضور ﷺ کی طرف وسیلے کے طور پر بھیجا اور اس کی برکت سے موسلا دھار بارش ہوئی (یہ روایت امام دارمی نے سنن کے مقدمے میں نقل کی ہے)

یہ مبارک عمل دیگر انبیاء کرام کے علاوہ خود دورِ نبوی ﷺ ، دورِ صحابہ اور تابعین سے لے کر موجودہ زمانے تک بطور صحیح عقیدہ جاری ہے اور اگر بعض لوگ دین کی صحیح سمجھ نہ

ہونے کی وجہ سے اعتراض کرنے لگے ہیں اور اسے توحید کے مقابلے شرک سمجھتے ہیں تو انہیں اپنے عقیدے کو درست کر لینا چاہیے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ احکامِ شریعت کی حقیقی روح کو سمجھیں اور اپنی کم علمی اور ناواقفیت کی وجہ سے دینی تصورات کا حلیہ نہ بگاڑیں۔

حضور ﷺ کے وسیلے سے امت سے عذاب کے ٹل جانے کے بارے میں رب کریم خود قرآنِ حکیم میں اس طرح ہماری رہنمائی فرماتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ أَنْتَ فِيْهِمْ ط وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ○

(الانفال، ۸:۳۳)

اور (درحقیقت بات یہ ہے کہ) اللہ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ان پر عذاب فرمائے درآنحالیکہ (اے حبیبِ مکرم!) آپ بھی ان میں (موجود) ہوں اور نہ ہی اللہ ایسی حالت میں ان پر عذاب فرمانے والا ہے کہ وہ (اس سے) مغفرت طلب کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی وجہ سے اپنے نظام کو بدل کے رکھ دیا۔ پہلی قوموں کے لوگ جب اللہ کی نافرمانی میں تمام حدیں پار کر جاتے تو انہیں فوراً عذابِ الٰہی کی گرفت میں لے لیا جاتا۔ اس کی کئی مثالیں قرآن حکیم میں درج ہیں۔ مگر جب حضور ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون وضابطہ ہی تبدیل کر دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کے وسیلے سے نہ صرف امتِ اجابت (مومنین و مسلمین) بلکہ امتِ دعوت (کفار ومشرکین) سے بھی دنیاوی عذاب اٹھا لئے گئے۔ یہ عذاب کا اٹھایا جانا کسی خاص وقت اور زمانے کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے ہے۔ اب اس وقت تک عذابِ الٰہی نہیں آئے گا جب تک آپ ﷺ کی نبوت و رسالت موجود رہے گی اور بلاشبہ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت قیامت تک جاری وساری رہے گی۔

39 عقیدۂ توسل......اکابرین امت کی نظر میں (۱)

ہم ذیل میں امت کے برگزیدہ اماموں اور علماء کرام کے خیالات ونظریات درج کر رہے ہیں، جو وسیلہ کے بارے میں ہمارے لئے سند کا درجہ رکھتے ہیں اور ان سے بات واضح ہوگی کہ وسیلہ پکڑنے کا عقیدہ قرآن وسنت کے عین مطابق ہے۔

۱۔امام زین العابدین رضی اللہ عنہ

آپ نے اپنے جدِ امجد حضورِ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں شعروں کی صورت میں جو کچھ عرض کیا ہے۔اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

☆ اے رحمت للعالمین! آپ گنہگاروں کی شفاعت کرنے والے ہیں،کل روزِ قیامت اپنے جودوکرم اور فضل واحسان سے ہمیں بھی شفاعت کی عزت بخشیں۔

☆ اے تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آنے والے! زین العابدین کی بھی دستگیری کیجئے جو (اپنے ہی اوپر) ظلم وستم کرنے والی جماعت میں گھرا ہوا ہے۔

۲۔امام مالکؒ

چار فقہی اماموں میں آپ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ایک دفعہ خلیفہ ابوجعفر منصور مدینہ منورہ آیا اور امام مالکؒ سے دریافت کیا۔

’’کیا میں دعا کرتے وقت اپنا رُخ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کروں اور پشت قبلہ کی جانب ہو۔اس پر امام مالکؒ نے جواب دیا:’’اے خلیفہ تم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے منہ کیوں پھیرتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے اور تمہارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کے لئے روزِ قیامت وسیلہ ہیں، تمہیں چاہیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب متوجہ ہوکر آپکی شفاعت کے طلبگار رہو ہوں تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے تمہاری شفاعت فرمائیں۔اس پر انہوں

نے سورۃ نساء کی آیت نمبر٦۴ کا حوالہ دیا۔اس واقعہ کو قاضی عیاضؒ نے ''الشِفاء'' میں صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۳۔امام قرطبیؒ

انہوں نے اپنی تصنیف ''الجامع لاحکام القرآن'' میں سورہ النساء کی آیت نمبر٦۴ کی تفسیر میں توسل کے عقیدے کو جائز قرار دیا ہے۔

۴۔امام محمد بن عبداللہ حاکمؒ

امام حاکم نے اپنی کتاب ''المستدرک'' میں توسلِ آدمؑ کا ذکر کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۵۔امام احمد بن حسین بیہقیؒ

امام بیہقیؒ نے ''دلائل النبوۃ'' میں حضرت آدمؑ کا بنی اکرم ﷺ کو وسیلہ کرنے والی روایت کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے اپنی کتاب میں اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ اس میں کوئی موضوع روایت ذکر نہ ہونے پائے۔امام موصوف نے عثمان بن حنیفؓ کی روایت بھی نقل کی ہے۔انہوں نے اس کتاب میں حضرت عمرؓ کی روایت بھی درج کی ہے جس میں حضرت عباسؓ کے وسیلہ سے بارش طلب کرنے کا واقعہ درج ہے۔

٦۔قاضی عیاضؒ

انہوں نے ''الشفاء'' میں صحیح احادیث کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کا نبی اکرم ﷺ سے توسل بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ اپنی کتاب کے بہت سے ابواب میں حضور نبی اکرم ﷺ کے خصائص وفضائل کا ذکر کیا ہے۔

۷۔شیخ الاسلام ابوزکریا یحییٰ نوویؒ

انہوں نے اپنی کتاب ''الایضاع'' کے چھٹے باب میں توسل کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی کتاب ''الاذکار'' میں ایسی دعائیں نقل کی ہیں جن سے توسل کا جائز ہونا ثابت ہے۔

۸۔امام ابن تیمیہؒ

انہوں نے اپنی کتاب ''قاعدة جليلة فى التوسل والوسيلة'' میں یہ ارشاد باری تعالیٰ نقل کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْاللّٰه وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے حضور تک (تقرب اور رسائی کا) وسیلہ تلاش کرو۔
(المائدہ،۵:۳۵)	

وہ لکھتے ہیں ''اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرنا حضور ﷺ پر ایمان اور آپ ﷺ پر اتباع کی وجہ سے ہے اور اسی وجہ سے یہ توسل آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپ ﷺ کے وصال کے بعد ظاہراً و باطناً فرض ہے لہذا کسی بھی حال میں کسی فرد واحد سے آپ ﷺ پر ایمان واطاعت کی وجہ سے کسی بھی عذر کے بناء پر یہ ساقط نہیں ہوتا اور اللہ کی رحمت تک پہنچنے اور اس کی گرفت سے بچنے کے لئے صرف اور صرف آپ ﷺ پر ایمان اور آپ ﷺ کی اطاعت کو وسیلہ بنانا ہی صحیح عقیدہ ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ مقامِ محمود پر فائز اور مخلوق کی شفاعت کرنے والے ہیں مقام محمود پر فائز اور آپ پر رشک کریں گے اور نبی اکرم ﷺ کا مرتبہ اللہ کے دربار میں سب سے عظیم ہے اور تمام شفاعت کرنے والوں میں سے سب سے بلند ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تمام انبیاء سے عظیم المرتبہ ہیں لیکن آپ ﷺ کی

شفاعت اور دعا سے صرف اس شخص کو نفع ملے گا جس کے لئے آپ ﷺ شفاعت اور دعا فرمائیں گے اور یہ کرم اس پر ہوگا جو آپ ﷺ کی شفاعت اور دعا کو وسیلہ بنائے گا جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ بنایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ امام ابن تیمیہؒ سے کسی نے پوچھا ''کیا نبی اکرم ﷺ کو وسیلہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے جواب میں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ سے توسل کرنے اور آپ کے وصال مبارک کے بعد صحابہ کا بارش کے لئے آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسل کرنے کا بطورِ خاص ذکر کیا۔

40 عقیدۂ توسل......اکابرین امت کی نظر میں (۲)

۹۔علامہ علی بن عبدالکافی سبکیؒ: انہوں نے اپنی کتاب "**شِفاء السقام فی زیارة خیر الانام**"، میں نہایت تفصیل کے ساتھ وسیلہ کے عقیدہ پر بحث کی ہے اوراس کو جائز ہونا ثابت کیا ہے:

۱۰۔حافظ امام عماد الدین ابن کثیرؒ: آپ نے اپنی کتاب "تفسیر القرآن العظیم" میں سورۃ النساء کی آیت نمبر۶۴ کی تفسیر میں توسل کا ذکر کیا ہے۔اوراس کے علاوہ اپنی کتاب "البدایۃ والنہایۃ" میں حضرت آدمؑ کا وسیلہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے اس روایت کے موضوع ہونے کا کوئی حکم بھی نہیں لگایا۔امام ابن کثیرؒ نے اس واقعے کا ذکر بھی کیا ہے جس میں ایک شخص نے حضورﷺ کی قبر مبارک پر آ کر آپ کے وسیلہ سے بارش کی دعا کی جس کو آپ نے صحیح روایت قرار دیا۔اپنی کتاب میں انہوں نے یہ بیان بھی کیا ہے کہ جنگِ یمامہ میں مسلمانوں کا جنگی نعرہ 'یا محمداہ' (اے محمد! مدد فرمایئے) تھا۔

۱۱۔حافظ ابن حجر عسقلانیؒ: انہوں نے اپنی کتب "الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ" اور فتح الباری میں اس آدمی کا ذکر کیا ہے جو حضور نبی اکرمﷺ کے مزار اقدس پر آپﷺ کا وسیلہ پکڑنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔

۱۲۔مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ: شعر و ادب، علم وحکمت اور حدیث میں آپ کو جو مقام حاصل ہے اسے سارا زمانہ اچھی طرح جانتا ہے۔مگر آپ کی شخصیت کا جو نمایاں پہلو تھا وہ آپ کا حضورﷺ کی ذات سے والہانہ عشق ہے،جس کی تڑپ اور کسک آپ کے بے شمار

اشعار میں جھلکتی نظر آتی ہے۔توسل کے بارے میں آپ کا یہ شعر زبان زد عام وخواص ہے۔

("اگر حضرت آدمؑ محمد ﷺ کے نام کا وسیلہ درمیان میں نہ لاتے تو ان کی توبہ قبول نہ ہوتی اور نہ نوحؑ کی کشتی طوفان میں غرق ہونے سے بچتی")

۱۳۔امام جلال الدین سیوطیؒ: آپ نے حضرت آدمؑ کی توسل والی حدیث اپنی کتاب "الدرالمنثور" اورالخصائص الکبریٰ" کے علاوہ "الریاض الانیقہ" میں بھی بیان کی ہے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ امام بیہقی نے اسے صحیح حدیث قرار دیا ہے۔

۱۴۔علامہ قسطلانیؒ: علامہ قسطلانی اولیاءکرام کے خاص گروہ کے اوصاف وکمالات کے تذکرے جومختلف حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب المواہب اللدنیہ میں لکھتے ہیں۔"جب عام لوگ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو سب سے پہلے نقباء دعا کرتے ہیں پھر باری باری نجباء، ابدال، اخیار اوراگران کی دعا قبول ہو جائے تو فبہا ورنہ غوث دعا کرتے ہیں اور دستِ طلب دراز کرنے سے پہلے ہی ان کی دعا قبول کرلی جاتی ہے۔یہ ایک طرح کا اللہ تعالیٰ کا ان پرخاص کرم ہوتا ہے۔

۱۵۔امام ابن حجر ہیثمی مکیؒ: آپ فقہا ومحدثین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے حضرت ابوعبداللہ قرشیؒ سے منسوب یہ واقعہ اپنی کتاب الفتاوی الحدیثیہ میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ مصر شدید قحط سالی میں مبتلا ہوگیا۔لوگ سخت بھوک اور پیاس کی مصیبت سے دوچار ہوگئے لیکن باوجود دعاواستغفار کے قحط کا عذاب ختم نہ ہوا۔آگے امام مکی کچھ یوں لکھتے ہیں۔

"جب میں نے ملک شام کی طرف سفر کیا اور حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے مزار مبارک کے نزدیک پہنچا تو آپؑ مجھے آکر ملے۔میں نے عرض کیا" اے اللہ کے رسول میں

آپ کے پاس مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ آپ میری ضیافت میں مصر والوں کے حق میں دعا فرما دیں۔ چنانچہ حضرت خلیل اللہؑ نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے قحط دور فرما دیا۔ اس تذکرے میں حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی جس ملاقات کا حال بیان ہوا ہے اس کی وضاحت میں حضرت امام یافعیؒ نے لکھا ہے: ''حضرت ابوعبداللہ قرشی کا یہ کہنا کہ حضرت خلیل اللہؑ مجھ سے ملے بالکل برحق ہے اس لئے کہ اس کا انکار فقط وہی جاہل کرسکتا ہے جو اولیاء کرام کے احوال ومقامات سے بے خبر ہو۔ کیونکہ یہ لوگ زمین وآسمان کا مشاہدہ فرماتے ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام کو بالکل زندہ حالت میں دیکھتے ہیں۔

۱۶۔ **شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ**: حضور غوث الاعظمؒ کی کتاب فتوح الغیب کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اولیاء کرام جب فنائے بشریت کی حد سے گزر کر معرفت کی وادیوں میں قدم رکھتے ہیں تو انہیں حق تعالیٰ سے خاص صلاحیت اور قوت عطا کردی جاتی ہے جس کی وجہ سے ظاہری اسباب کے بغیر کئی افعال سرزد ہونے لگتے ہیں اور وہ عالمِ فناء سے عالمِ بقا میں اللہ کی تجلیات کا مظہر بن جاتے ہیں۔ اس طرح سے انہیں دنیا میں وہ شان حاصل ہو جاتی ہے جو عام مومنین کو جنت میں جا کر حاصل ہوگی۔

41 حضور نبی اکرم ﷺ کے وسیلے سے مغفرت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا○

(النساء، ۴:۶۴)

اور (اے حبیب!) اگر وہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (ﷺ) بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بناء پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضور نبی کریم ﷺ کا مقام اور مرتبہ اتنا عظیم ہے کہ انسان کی محدود اور ناقص عقل اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتی۔ اوپر درج کردہ آیت کے مفہوم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح آپ ﷺ کی ظاہری حیات میں آپ سے وسیلہ کرنا جائز تھا اسی طرح آپ کے وصال فرما جانے کے بعد بھی ایسا کرنا شریعت کے حکم کے عین مطابق ہے۔ کوئی شرعی و عقلی دلیل ایسی نہیں جو بعد از وصال آپ سے وسیلہ پکڑنے کو ناجائز قرار دیتی ہو۔ سوچنے سمجھنے والی بات یہ ہے کہ جب ہم اپنے اعمال جیسے تیسے بھی وہ ہیں ان کو اللہ کی بارگاہ میں وسیلہ بنانا جائز سمجھتے ہیں تو پھر نبی کریم ﷺ کی ذات کو اس کے حضور بطور وسیلہ پیش کرنا اور بھی زیادہ جائز عمل ہونا چاہیے، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ جبکہ ہم آپ ﷺ کے

ارشاداتِ عالیہ پرعمل کرتے ہوئے جو نیک اعمال کرتے ہیں وہ سنتِ رسول ﷺ کہلاتے ہیں۔ پھر جب سنت سے وسیلہ کرنا جائز ہوا تو اس ذات سے کیوں نہیں جس نے ہمیں یہ سنت عطا کی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ آپ ﷺ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ افضل ہیں اور ہمیں جو نیک اعمال کی توفیق ملی ہے وہ آپ ﷺ ہی کی ہدایت سے نصیب ہوئی ہے۔ یہ بات ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے اور ہمارے نزدیک صحیح عقیدہ بھی یہی ہے کہ جب ہم آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس، اللہ کے محبوب اولیاء صالحین یا اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر اللہ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں تو ان تمام صورتوں میں ہم ہرگز ان کو اللہ کا شریک یا اس کے برابر نہیں سمجھتے۔ اعمال اور جس ذات کا وسیلہ دیا جارہا ہوتا ہے تو وہ محض ذریعہ ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات وسیلہ قبول کرنے والی اور وحدہٗ لاشریک ہے، کوئی رسول، نبی، ولی اور کوئی زندہ یا مردہ اس کی ذات وصفات میں اس کا ساجھی اور برابر ہو نہیں سکتا۔ گویا وسیلہ کی تمام صورتوں میں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس کے ہاتھ وسیلہ اور دعا قبول کرنے کی باگ ڈور ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ہر کسی کی دعا اور پکار کو بغیر وسیلہ کے براہِ راست سن لے اور وسیلے کے بغیر قبول بھی کرلے، مگر اتنا ضرور ہے کہ وسیلہ سے قبولیت کی امید بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان ہستیوں کا وسیلہ پکڑ کر ہم درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کر رہے ہوتے ہیں اور ہماری التجاء و پکار اور مناجات اسی کے حضور ہوتی ہیں، اس امید کے ساتھ کہ اس کی ذاتِ کریمی اپنی مخلوق میں سے محبوب اور مقرب بندوں اور ان پسندیدہ اعمال کے صدقے سے جن کی توفیق اس نے ہمیں عطا فرمائی ہماری دعاؤں اور التجاؤں کو ضرور شرفِ قبولیت سے نوازے گی، مشکلات اور مصائب و آلام میں ہماری حاجتیں اور مرادیں پوری فرمائے گی اور ہمارے تمام گناہوں پر اپنے حبیب ﷺ کے وسیلے سے عفوو درگزر کی قلم پھیر دے گی۔

سورۃ النساء کی اس آیتِ کریمہ کو صرف حضور نبی اکرم ﷺ کی ظاہری حیات ہی سے منسوب نہیں کر لینا چاہیے جیسا کہ بعض لوگوں کا نظریہ ہے۔ایسا کرنا قرآنی ارشاد کا غلط معنی مراد لینا ہے۔اور یہ تاویل اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص جو آیت کا یہ مفہوم لے رہا ہے ۔قرآن کی روح سے آشنا نہیں۔مفسرین اور محدثین نے اس آیت کی تفسیر اور شرح کرتے ہوئے اسے توسلِ مطلق قرار دیا ہے۔

امام حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ سورۃ النساء کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مشہور حکایات کی کتاب ''الحکایات المشھورہ'' میں درج واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔ جسے عتبی نے بیان کیا کہ میں حضور ﷺ کی قبر انور کے پاس بیٹھا تھا تو ایک اعرابی آیا اور اس نے **السلام علیك یا رسول الله** کہہ کر وہی آیت پڑھی اور عرض کیا کہ میں اپنے گناہوں پر استغفار کرتا ہوں اور آپ کو اپنے رب کے سامنے اپنا سفارشی بنا کر حاضر ہوا ہوں۔ پھر اس نے کچھ نعتیہ اشعار پڑھے اور لوٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آ گئی اور خواب میں نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جا اس اعرابی کو خوشخبری سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔

42 نبوت اور علمِ غیب کا تعلق

علمِ غیب انبیاء علیہم السلام کے لئے ثابت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور انبیاء کو علمِ غیب عطاء نہ ہوتا تو نبوت کا کوئی معنی ہی نہ رہتا کیونکہ نبوت کا معنی ہی علمِ غیب پر مطلع کرنا ہے اور نبی اس ہستی کو کہتے ہیں جس کو اللہ غیب کی خبریں دے۔

علمِ غیب کا انبیاء علیہم السلام کے لئے تسلیم کرنا ضروری ہے مگر علمِ غیب ثابت کر کے اس کی بنیاد پر ان میں سے کسی کو عالم الغیب کہنا درست نہیں کیونکہ عالم الغیب فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِط وَ هُوَالْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُO	(وہی) ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے اور وہی بڑی حکمت والا خبردار ہے
(الانعام،۶:۷۳)	

اور اللہ تعالیٰ اپنے علم میں سے اگر چاہے تو اپنے رسولوں کو بھی عطا فرما دیتا ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا O اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ.	اللہ تعالیٰ غیب کو جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب پر کسی کو آگاہ نہیں کرتا بجز اس رسول کے جس کو اس نے (غیب کی تعلیم کے لئے) پسند فرما لیا ہو
(الجن،۷۲:۲۶،۲۷)	

غیب جاننے والا رب جب اپنے رسول ﷺ کو علمِ غیب پر مطلع فرما دیتا ہے تو پھر اس کے ساتھ اسے یہ اذن بھی دے دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی غیب کی خبریں پہنچائے اور یہ وہ فریضۂ نبوت ہے جس میں آپ ﷺ کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنَ　　　　اور وہ غیب کی بات بتانے میں ذرا بخل نہیں کرتے (التکویر،۸۱:۲۴)

یعنی وہ رسولِ مقبول ﷺ نہ صرف یہ کہ عطا کئے جانے پر خود غیب جانتے ہیں بلکہ اسے بتانے میں ذرا بھر بخل نہیں کرتے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ جس کے پاس غیب کی باتیں ہوں گی وہی انہیں دوسروں کو پہنچائے گا۔اس کی مثال یوں ہے کہ جس کے پاس پیسہ ہی نہ ہواور وہ غریب ومفلس ہواور کسی کو کچھ نہ دے تو اس کے بارے میں کوئی نہیں کہے گا کہ وہ بخیل ہے، بخیل تو اسے کہا جائے گا جسے اللہ نے دولت دے رکھی ہواور وہ اسے دوسروں سے چھپا کر رکھے۔ جب قران مجید کہہ رہا ہے کہ میرا رسول علمِ غیب کی دولت بانٹنے میں بخیل نہیں ہے تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں وہ بانٹنے میں بخل سے کام نہیں لیتا بلکہ جو ان کا حقدار ہوتا ہے انہیں دیتا رہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی اوپر والی دونوں آیتیں حق ہیں۔ ان میں کوئی تضاد اور فرق نہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ جب خدا کے غیب جاننے کی بات ہوگی تو بالذات جاننے کی بات ہوگی اور معنی یہ ہوگا کہ بتائے بغیر اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ اور جب اللہ کے محبوب کے غیب جاننے کی بات ہوگی تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے ان کو بتا دیا ہے، اس کے بتانے سے وہ غیب جانتے ہیں اور جو حق جاننا چاہتے ہیں انہیں حق بتانے میں وہ بخل نہیں کرتے۔

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ علمِ غیب اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا ایک خاصہ ہے۔ مگر ایسا نہیں کہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس میں سے کچھ ہی عطا نہیں کرتا۔ بلکہ یہ وہ عام صفت ہے جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو ذاتی کہلائے گی اور جب اس کے محبوب بندوں میں سے کسی کی طرف ہو تو وہ عطائی کہلائے گی۔

یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اذنِ الٰہی سے جو کسی کو عطا ہوتا ہے وہ ہرگز

شرک نہیں۔ شرک تب ہوگا جب اللہ کے سوا کسی اور کے لئے علم ذاتی ہونے اوراس کے علم کے ذاتی تصرف کو ثابت کیا جائے، لیکن اس کے برعکس اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ اس کا اپنا اذن نہیں بلکہ اذنِ الٰہی ہے جواس کے ہاتھ اور زبان سے جاری ہورہا ہے تو یہ ہرگز ہرگز شرک نہیں ہوگا۔ اس کی تصدیق ایک حدیث قدسی سے ہوتی ہے جس میں حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالی ارشاد فرماتا ہے۔

ولایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی فاذا احببتهٗ فکنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصره به و یده التی یبطش بها و رجله التی یمشی بها وان و سالنی لا عطینه

صحیح البخاری،۲: ۹۶۳، کتاب الرقاق، رقم حدیث: ۶۱۳۷

میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہانتک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پھراس کی سماعت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اسکی بصارت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھے سوال کرے تو میں ضرور اسے عطا فرماتا ہوں۔

یہ مقام جس کا اس حدیث مبارکہ میں ذکر ہوا ہے صاف ظاہر ہے کسی کافر اور مشرک کو میسر نہیں ہوسکتا بلکہ انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام اور اولیاء عظام ہی کو نصیب ہوتا ہے کیونکہ وہ نفلی عبادات اور اطاعت کرتے کرتے اللہ کے اتنے قریب ہوجاتے ہیں کہ اللہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے اور پھر اس مقام پر ان سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ اللہ کے اذن اور اس کی عطا سے ہوتا ہے۔

43 حضور ﷺ کا علمِ غیب قرآن کی نظر میں

علمِ غیب نبوت کے خصائص میں سے ایک خصوصیت ہے۔حضور ﷺ کی یہ خصوصیت کمال درجے کی ہے اور آپ ﷺ کی ذات علمِ غیب عطائی کی بلند ترین مثال ہے۔ آپ کو جو شان عطا ہوئی اس تک انسانی عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ تاہم یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ ساری کائنات کا علم حضور نبی اکرم ﷺ کے علم کے مقابلے میں ایک جز کی حیثیت رکھتا ہے۔قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے روح کی حقیقت کے بارے میں سوال کرنے والوں کو یہ جواب ارشاد فرمایا

قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۵)

فرما دیجئے روح میرے رب کے امر سے ہے اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو جو علوم عطا کئے ہیں وہ بہت قلیل ہیں لیکن حضور ﷺ کو علم کی جس دولت سے نوازا گیا ہے اس کی وسعت کا اندازہ اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس علم کے ذریعے مشرق سے مغرب تک کائنات کی تمام چھپی ہوئی حقیقتوں کو جان لیا۔آپ ﷺ کے علمِ غیب پر قرآن وحدیث شاہد ہیں۔ہم یہاں دلیل کے طور پر قرآن حکیم کی ان آیات کا حوالہ درج کریں گے جن میں حضور ﷺ کے علمِ غیب پر مطلع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ ۚ (ھود ۱۱:۴۹)

یہ بیان ان غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں امام خازنؒ لکھتے ہیں کہ یہاں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے کہ ہم نے آپ کو حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کے جس واقعے کی خبر دی ہے وہ غیب کی خبروں میں سے ہے۔ ہم نے اس غیب سے آپ کو آ گاہ فرما دیا ہے۔

حضور ﷺ کے علم غیب کے بیان میں سورۃ نساء کی اس آیت کریمہ میں نہایت جامع انداز اختیار کیا گیا ہے۔

وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا O	اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔
(النساء ۴:۱۱۳)	

۲۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ بیضاویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس سے مراد مخفی امور اور دینی احکام کا علم ہے۔ اسی طرح امام اسماعیل حقیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے غیب اور پوشیدہ باتوں کا وہ علم عطا فرما دیا تھا جو آپ اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

(تفسیر البیضاوی، ۱:۳۸۰)

۳۔ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کہ حضور ﷺ اپنے اس فرضِ منصبی کو بطریقِ احسن ادا کرتے ہیں قرآن حکیم یوں بیان فرماتا ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍO	اور وہ (نبی اکرم) غیب (کے بتانے) پر بالکل بخیل نہیں ہیں۔
(التکویر ۸۱:۲۴)	

امام بیضاویؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ علم وحی اور غیبی امور کی تعلیم و تبلیغ کے بارے میں بخل نہیں فرماتے۔ اس لئے یہ بات ذہن میں رہے کہ بخیل اسے کہتے ہیں جس کے پاس دولت ہو اور وہ اس میں سے خرچ نہ کرے بلکہ اسے چھپا چھپا کر

رکھے۔ مگر وہ جو خود مفلس اور نادار ہو اور کسی کو دے یا نہ دے اسے بخیل نہیں کہا جا سکتا۔ لہذا رسول کریم ﷺ کے غیب بتانے میں بخیل نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں وہ اپنے آپ خود تک محدود نہیں رکھتے۔ اب رہا یہ سوال کہ ہمارے آقا و مولا ﷺ کتنا غیب جانتے ہیں اور کتنا نہیں جانتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ اتنا غیب جانتے ہیں کہ کوئی جو چاہے پوچھ لے آپ غیب بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ وہ غیب حقیقی کی بھی خبر دیتے ہیں اور غیب اضافی کی بھی۔ اگر آیت میں مذکور غیب سے قرآن مراد لیا جائے تب بھی یہ بات ثابت ہے کہ قرآن بھی حضور ﷺ کے علوم میں شامل ہے اور اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ اس لیے یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیب کے بارے میں خبریں دی جاتی ہیں اور حضور ﷺ کا معاملہ تو تمام انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر ہے۔ حضور ﷺ کے علم غیب کے بارے میں تفسیرِ خازن میں ہے کہ محمد ﷺ آسمانی خبریں اور واقعات جن پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطلاع دی بغیر کسی کمی بیشی کے بیان فرما دیتے ہیں۔ وہ یہ بیان کرتے ہوئے بخل نہیں فرماتے اور کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتے۔

44 علمِ مصطفیٰ ﷺ بحث و تکرار کا موضوع کیوں؟

آج کل لوگ حضور ﷺ کے علمِ غیب سے متعلق ''کُل'' اور ''جز'' کے جھگڑے میں گرفتار نظر آتے ہیں، ان کے مناظرے اور جھگڑے ختم ہونے کو نہیں آتے۔ کوئی علمِ مصطفیٰ ﷺ کو ''کُل'' کہتا ہے اور کوئی ''جز'' کہتا ہے حالانکہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ نکتہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ گویا اس جھگڑے کے حل کے لئے یہ بات جان لینی چاہیے کہ ہر ''کُل'' ایک نسبت سے کل اور دوسری نسبت سے جز ہے یعنی کسی شئے کو کُل یا جز قرار دینا موازنہ اور تقابل کے بغیر ممکن نہیں۔ لہذا ہمیں سب سے پہل اس امر کا تعین کرنا ہوگا کہ جزئی اور کُلی ہونے کا ہم نے جو معیار قائم کر رکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کوئی شے اپنے مدمقابل کے حوالے سے ''کُل'' کی حیثیت رکھتی ہے اور جب مقابل بدل جائے تو کسی دوسرے مقابل کے حوالے سے اسی شے کی حیثیت جزئی ہو جاتی ہے۔

ایک عام مثال کے حوالے سے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ آپ کے محلے کی مسجد کے محراب اور بام و در میں اگر محراب و مسجد کا موازنہ کریں تو محراب اور مسجد کے اندر کے صحن کے حوالے سے مسجد ''کُل'' اور محراب اس کا جز ہوگا۔ اب اسی مسجد کا موازنہ محلے سے کریں تو وہ مسجد جو محراب کے مقابلے میں ''کُل'' تھی محلے کے مقابلے میں ''جز'' قرار پائے گی جبکہ محلّہ اس کے مقابلے میں ''کُل'' کی حیثیت کا حامل ہوگا۔ اسی طرح محلے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ جز ہے اور شہر کل ہے اور شہر کو ملک کے مقابلے میں لیا جائے تو شہر جز ہوگا اور ملک ''کُل''، اسی طرح ملک کو اگر دنیا کے مقابلے میں دیکھا جائے تو یہ بھی جز

بن جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ ''جز'' اور ''کُل'' ایک اضافی رشتہ ہے اور جس کو ختم کرنے کے لئے کوئی حد متعین نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کہ ہر ''کُل'' دوسرے اعتبار سے جز ہوتا ہے۔

اس بارے میں کوئی اور بات نہیں کہی جاسکتی سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں حضور نبی کریم ﷺ کا علم جزئی قرار پائے گا لیکن اگر حضور نبی اکرم ﷺ کے علم کا موازنہ ہم بنی نوع انسان اور جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حوالے سے کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ تمام مخلوق کے حوالے سے حضور نبی اکرم ﷺ کا علم ''کُلی'' ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں علم جزئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو جو علم عطاء فرمایا ہے وہ ساری کائنات پر حاوی ہے۔ ساری کائنات کا علم مل کر حضور ﷺ کے علم کے مقابلے میں ایسے ہی ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ۔ مگر آپ ﷺ کے علم کا مقابلہ اللہ تعالی کے علم سے کرنا چاہیں تو یہ بڑی نادانی اور جہالت کی بات ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی علم کی کوئی حد ہی نہیں جبکہ حضور ﷺ کا علم محدود ہے لیکن اس علم کی حدیں کہاں ختم ہوتی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

قرآنِ حکیم کی متعدد آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے بالخصوص حضور ﷺ کو اللہ رب العزت نے علم غیب عطائی میں سے حصہ وافر عطا کیا ہے۔ چند آیات بطور خاص نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہیں۔

١. وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَآءَ — اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے۔ (البقرہ،٢:٢٥٥)

یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور مخلوق میں کسی کی مجال نہیں کہ علم الٰہی کا احاطہ کر سکے مگر یہ کہ وہ اپنے خاص بندوں میں سے

جسے چاہے اور جس قدر چاہیے علم عطا فرما دے۔

۲. وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

(آل عمران،۳:۱۷۹)

اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ اسے (عام لوگو!) تمہیں غیب پر مطلع فرما دے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے۔

حضور ﷺ خلائق میں سے افضل ہیں۔ اس لئے یہ امر یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے علوم غیب میں سے جس قدر چاہا عطا کر دیا۔

۳. عالم الغيب فلا يظهر على غيبه احداO الا من ارتضى من رسول

(الجن،۷۲:۲۷)

وہ غیب کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے

اس امر میں اب شک رہا ہی نہیں کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ پسندیدہ اور مرتضیٰ و مجتبیٰ رسول ہیں۔ اس لئے یہ بات قطعی طور پر نصِ قرآن سے ثابت ہو گئی کہ مطلع علی الغیب ہونے میں آپ ﷺ کا مقامِ گروہ انبیاء میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ لہذا حضور ﷺ کے علم غیب کو بحث و تکرار اور مناظروں کا موضوع بنانا تحصیلِ لا حاصل کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔

45 تصورِ بدعت اور اس کی شرعی حیثیت

شریعت کی اصطلاح میں بدعت کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

''ہر وہ نیا کام جس کی کوئی اصل بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن میں ہو نہ سنتِ رسول ﷺ میں اور اس کو ضروریات دین میں شمار کرتے ہوئے دین میں شامل کرلیا جائے۔'' یاد رہے کہ ضروریاتِ دین ان چیزوں کو کہتے ہیں جن میں سے کسی ایک کا انکار کرنے سے کفر لازم ہو جاتا ہے۔

ایسی بدعت جو اس تعریف کے زمرہ میں آتی ہے ''بدعت سیئہ'' یا ''بدعت ضلالہ'' کہا گیا ہے اور حضور ﷺ کے ارشاد ''کل بدعة ضلالة'' سے یہی مراد ہے کہ ہر بدعت ضلالت یعنی گمراہی کے ذیل میں آتی ہے۔

لیکن رہا یہ سوال کہ کیا ہر نیا کام ناجائز ہے؟ اس حوالے سے جواب طلب ہے کہ ایسے نئے امور جن کی اصل قرآن وسنت میں نہ ہو اپنی اصل کے اعتبار سے تو بدعت ہی شمار کئے جائیں گے، لیکن اگر شرعی اصول کے مطابق اس کلیے کو معیار تسلیم کرلیا جائے تو دین کی تعلیمات کا کم وبیش ستر سے اسی فیصد حصہ بدعت اور اجتہاد کی ساری صورتیں اور شکلیں ناجائز قرار پاتی ہیں کیونکہ دینی علوم سیکھنے کے لئے اصولِ تفسیر وحدیث، فقہ واصولِ فقہ، صرف، نحو، منطق وفلسفہ اور دوسرے تمام معاشرتی ومعاشی علوم جو دین کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں ان کا سیکھنا سکھانا حرام تصور ہوگا، کیونکہ ان کی تصدیق وتوثیق نہ تو قرآن سے ہوتی ہے نہ حدیث سے اور نہ ہی صحابہ کرام کے عمل سے کوئی تائید ملتی ہے، کیونکہ اگر ہر نیا

کام بدعت ٹھہرے تو پھر درسِ نظامی کی تعلیم وتدریس کا سارا نظام ہی گمراہی قرار پائے گا۔

بدعت کا یہ تصور جو بعض ذہنوں میں پایا جاتا ہے اسے صرف ایک مغالطہ اور غلط فہمی ہی کہا جائے گا۔ بدعت کا حقیقی تصور جس سے یہ واضح ہو کہ بدعت کا حقیقی اطلاق کن کن بدعتوں پر ہوتا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کے مفہوم کو سمجھنا ہوگا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من احدث فی امرنا ھٰذا ما لیس منه، فھو ردّ۔	جو ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ رد کی جاتی ہے۔

صحیح البخاری، ۱:۳۷۱، کتاب الصلح، رقم حدیث: ۲۵۵۰

اس حدیث مبارکہ کو صحیح مسلم کی اس روایت کی روشنی میں دیکھنا ہوگا جس میں آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا کوئی امر موجود نہیں تو وہ مردود ہے'' اس سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ کوئی بھی کام چاہے وہ نیک ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے ایصالِ ثواب، میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اخلاقی، روحانی ومعاشرتی امور پر قرآن وحدیث سے کسی نص کے موجود نہ ہونے سے وہ کام حرام ہو جاتا ہے تو پھر شریعت کے ان بے شمار کاموں کا کیا بنے گا، جن کو مباح قرار دیا گیا ہے کیونکہ مباح تو کہتے ہی اس کو ہیں جس کے کرنے کا شریعت میں حکم نہ ہو۔

روایتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا صحیح اطلاق اس صورت میں ہوگا کہ کوئی ایسی مثال یا دلیل نہ بن جائے جس کا کسی جہت اور طریق سے کوئی تعلق دین کے ساتھ نہ ہو اور وہ مثال یا دلیل دین کے مخالف اور متضاد نہ ہو اور نہ ہی قرآن وسنت کے کسی حکم کو توڑنے والی ہو۔

واضح ہو کہ بدعت کا اطلاق دراصل دو باتوں پر ہوتا ہے، ایک شرعی ، دوسرا

اصطلاحی۔شرعی بدعت کوحضورﷺ نے ان امور سے خاص کر دیا ہے جنہیں ’’محدثات‘‘ کہا گیا ہے۔ یہ محدثات وہ فتنے تھے جو حضورﷺ کے وصال کے فوراً بعد خلافتِ راشدہ کے دور میں اختلافاتِ کثیر کی صورت میں ظاہر ہو گئے تھے اور ان فتنوں سے بچنے کی خاطر آپ نے تلقین فرمائی تھی کہ امت کو چاہئے کہ وہ میری اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنت پر چلتی رہے۔ چنانچہ تاریخِ اسلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں جھوٹے مدعیانِ نبوت، منکرینِ زکوٰۃ، ارتداد اور خوارج کے فتنے پیدا ہوئے، جنہوں نے اسلامی ریاست کے وجود کو شدید خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔ یہ بدعت کی اتنی خطرناک مثالیں تھیں کہ خلیفۂ وقت کو ان فتنوں کو دبانے کے لئے جنگیں لڑنی پڑیں۔

اس بناء پر محدثات ان فتنوں کو کہا جاتا ہے جن کی وجہ سے امت میں کثیر اختلافات پیدا ہوئے اور امت میں کئی گروہ پیدا ہو گئے، جنگیں ہوئیں اور ہزاروں افراد شہید ہوئے۔ اس ضمن میں صحیح مسلم کی ایک روایت جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں، میں مذکور ہے کہ جب کچھ لوگوں کو جہنم کی طرف کھینچ کر لے جایا جا رہا ہوگا تو حضورﷺ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے ’’اے میرے رب یہ تو میرے صحابی ہیں، اس پر جواب ملے گا۔ ’’انك لا تدری ما احدثو بعدك ‘‘ (اے میرے حبیبﷺ آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا احداث یعنی بدعتیں ایجاد کی تھیں۔)

تو اس حدیث میں بدعت کے حوالے سے بعد میں آنے والی امت کی نہیں بلکہ ان مرتدین کا بیان ہے جو حضورﷺ کے دور میں داخل اسلام ہوئے اور بعد میں مرتدین، منکرین زکوٰۃ، جھوٹے مدعیانِ نبوت اور خارجی بن گئے۔

اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ وہ کام جو ہو تو نیا لیکن شرعاً ممنوع نہ ہو اور نہ ہی واجب کی طرح ضروری ہو بلکہ عام مسلمان اسے ثواب سمجھ کر کریں اور جو نہ کرے

وہ شرعاً گنہگار بھی نہ ہو مگر کرنے والے کو ثواب ملتا رہے۔ جیسے مسافر خانے، سرائے اور مدرسے کی تعمیر جیسے سینکڑوں امور جن میں محافلِ میلاد، محافل عرس بھی آجاتے ہیں جو عام مسلمان ثواب کی خاطر منعقد کرتے ہیں اور ان میں کوئی نہ شامل ہو سکے تو وہ گنہگار نہیں ہوتا ایسے سب کام بدعتِ حسنہ میں شمار ہوتے ہیں جن کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

مارای المسلمون حسنا فهو عندالله حسن و مارای المسلمون سئيا فهو عند الله سيئی

جس کو (بالعموم) مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے ہاں بھی اچھا ہے اور جس کو مسلمان برا جانیں وہ خدا کے نزدیک برا ہے۔

(المستدرک، ۳:۸۷)

46 شفاعت پر جمہور مسلمانوں کا عقیدہ

شفاعت جمہور مسلمین کا وہ عقیدہ ہے جو قرآن حکیم کی متعدد آیاتِ مقدسہ، احادیثِ مبارکہ اور اجماعِ امت سے قطعی طور پر ثابت ہے اور اس پر ایمان رکھنا ضروریات دین میں شامل ہے۔ شفاعت کے وجود کا مطلقاً انکار کفر ہے۔ لہذا ہمیں یہ کہنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کہ شفاعت کا منکر دین کی مسلمہ باتوں کا منکر ہے اور اس کے انکار کو اس کی ازلی بدبختی اور شقاوت ہی سمجھا جائے گا۔

شفاعت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو یہ مقام و مرتبہ عطاء فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے اذن سے اس کے گناہگار بندوں کی شفاعت کریں اور وہ ذاتِ کریم اپنے بے پایاں فضل و کرم سے ان کی شفاعت کو قبول فرما لے گا اور اسی شفاعت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ روزِ محشر حساب و کتاب بھی جلدی شروع فرمائے گا اور اپنے گنہگار بندوں کی بخشش فرما کر انہیں جنت عطا فرمائے گا۔

امتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ بے اندازہ احسان ہے کہ اس نے اس میں وہ جلیل القدر اور عظیم المرتبت رسول بھیجا جو تمام مخلوقات میں سب سے بڑھ کر افضل و اعلیٰ اور محبوبیت کے مقام پر فائز ہیں اور روز قیامت شفاعتِ عظمیٰ کا اعزاز حضور نبی اکرم ﷺ ہی کو بخشا جائے گا اور آپ ﷺ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کی امت کے بے شمار گناہگاروں کو معاف فرما دے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ:

لِيَغْفِرَلَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ (اے محبوب تا کہ) اللہ تعالیٰ تمہاری

ذَنۡبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ...... (الفتح، ۴۸:۲)

خاطر بخش دے ان کو جو آپ کے تابع ہو گئے خواہ آپ سے پہلے گزر گئے یا بعد میں آئیں گے۔

اس آیت کریمہ کے ذریعے قرآن نے دوٹوک انداز میں یہ بنیادی نکتہ کھول کر بیان کر دیا ہے کہ امتِ مسلمہ کی بخشش اور مغفرت کا دار و مدار نسبتِ رسالت کے استحکام پر ہے اور اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ عاصیوں کی مغفرت کا مرکز و محور حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات کریمانہ ہے اور جب تک اس نسبت کو پختہ اور محکم نہ کیا جائے اسلام میں بخشش اور مغفرت کا کوئی تصور نہیں۔

بلاشبہ حضور ﷺ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا گیا اور آپ کی رحمتیں اور شفقتیں اس امت پر اتنی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ﷺ کی شانِ رحمت و عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی گناہگار امتی اپنی بخشش کا پروانہ حاصل کرنا چاہے تو قرآن حکیم کے مطابق اسے مصطفیٰ ﷺ کی چوکھٹ پر آ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنا ہوگی اور اس سلسلے میں ارشاد فرمایا گیا:

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡآ اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَلَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُو اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا○

(النساء، ۴:۶۴)

اور (اے حبیب) اگر وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ پر (آپ کی نافرمانی کرکے) ظلم کیا تھا آپ کے پاس (نادم ہوکر) آتے پھر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (یعنی آپ بھی) ان کے لئے معافی طلب فرماتے تو (یہ لوگ) اللہ کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے

سورہ الفتح کی آیہ کریمہ میں ''ذنبك'' کے معانی کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض نادان لاعلمی اورادب رسالت سے ناواقف ہونے کے باعث ذنب سے مراد فقط گناہ لیتے ہیں اوراس کا اطلاق معاذ اللہ حضور کی ذات گرامی پر کرنے لگتے ہیں۔ انہیں آگاہ ہونا چاہیے کہ یہاں ''ذنب'' سے مراد آپ کے گناہ ہرگز نہیں ہےاور بفرض محال ایک لمحہ کے لے اس کوتسلیم بھی کرلیا جائے تو گناہ کا وجود ہی نہیں بنتا کیونکہ گناہ سے توبہ کی صورت میں گناہ پہلے ہوتا ہے اور مغفرت اس کے بعد ہوا کرتی ہے اوراس مغفرت کی وجہ سے گناہ کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہےتو سوچنے والی بات یہ ہے کہ جب گناہ کے وجود سے بھی پہلے حضور کومعصوم عن الخطاء قرار دے کر مغفرت عطا فرما دی گئی تو وہاں گناہ کا گزر کیونکر ہوگا۔

اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ گناہوں سے بخشش حضور ﷺ ہی کے صدقے سے نصیب ہوتی ہےاوراگر کوئی بخشش ومغفرت کی خیرات چاہتا ہےتو اسے چاہیے کہ وہ آپ کی شفاعت حاصل کرنے کے لئے آپ ﷺ کی غلامی کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال لے۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ بخشش ومغفرت اللہ تعالیٰ کی عطائے خاص ہے جوصرف آپ ﷺ ہی کا حق ہے اورامت کو آپ ﷺ کے صدقے سے عطا کی جاتی ہے۔اس حق کو پورا کرنے کے لئے ہی آپ کواذنِ شفاعت دیا گیا ہےاورارشاد باری تعالیٰ

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰىO	اور آپ کا رب عنقریب آپ کو (اتنا کچھ) عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

(الضحیٰ،۹۳:۵)

اس آیت کا مصداق آپ ﷺ ہی کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میں اپنے محبوب پر اپنی عطاؤں کا دروازہ کھلا رکھوں گا اور آپ ﷺ کی شفاعت کا سلسلہ اس

وقت تک جاری رکھوں گا جب تک میرا محبوب راضی نہ ہو جائے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ رحمت للعالمین ہیں اور امت پر آپ ﷺ کی عنایات اور کرم نوازیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ حضور ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں:

اذاً واللہ لا ارضی و واحد من امتی فی النار	خدا کی قسم میں اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میرا ایک بھی امتی دوزخ میں ہو۔

(تفسیر قرطبی، ۹۶:۱۰)

اور آپ ﷺ ہی کو شفاعتِ کبریٰ کا وہ مقام عطا کیا گیا جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدً	عنقریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود (یعنی مقام شفاعت عظمیٰ) پر فائز فرمائے گا۔

(الاسراء، ۷۹:۱۷)

اور شفاعت کا یہی وہ بلند مقام ہے جہاں پر حضور اکرم ﷺ اپنی امت کے باب میں جو کچھ عرض کریں گے اسے شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔

47 شفاعتِ کبریٰ حضور نبی اکرم ﷺ کا خاصہ ہے

بلا شبہ حضور ﷺ جملہ مخلوقات میں سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں۔ وہ آپ ﷺ کو بہت سے ایسے امتیازات عطا فرمائے گا جو آپ کے سوا کسی اور نبی کے حصے میں نہیں آئے۔ ان میں سے ایک شفاعت بھی قابلِ ذکر ہے۔ صحیح البخاری اور صحیح لمسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

جامع الترمذی اور حدیث کی دیگر کتابوں میں حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس اللہ کا پیغام آیا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا کہ میری آدھی امت کو جنت میں داخل کر دے یا مجھے شفاعت کا عام حق دے دیا جائے، میں نے شفاعت کو اختیار کر لیا اور یہ شفاعت ہر اس مسلمان کے لئے ہے جو شرک پر نہیں مرے گا''۔

حضور نبی اکرم ﷺ رؤف و رحیم ہیں، اپنی امت کی بھلائی چاہنے والے اور ان پر نہایت شفیق ہیں۔ آپ ﷺ کی رحمت و شفقت کے حوالے سے قرآن حکیم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌO

(التوبہ،۹:۱۲۸)

''بے شک تمہارے پاس تم میں سے (ایک باعظمت) رسول تشریف لائے تمہارا تکلیف و مشقت میں پڑنا ان پر سخت گراں (گزرتا) ہے (اے لوگو!) وہ

تمہارے لئے (بھلائی اور ہدایت کے)
بڑے طالب و آرزو مند رہتے ہیں
(اور) مومنوں کے لیے نہایت (ہی)
شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں آپ ﷺ کو مومنوں کے لئے نہایت شفیق اور بے حد رحم فرمانے والا قرار دیا گیا اور اسی رحمت و شفقت کی وجہ سے آپ ﷺ نے امت کے لئے شفاعت کو اختیار فرمایا کیونکہ روایت کے مطابق اگر آپ ﷺ نصف امت کو بخشوانے کا اختیار لیتے تو باقی نصف امت میں سے کسی خطا کار اور گنہگار امتی کے لئے جو آپ ﷺ سے التجا کرتا کہ حضور ﷺ ہم پر بھی نظر کرم کیجئے تو عدم اختیار کی وجہ سے آپ کیسے بارگاہ الٰہی میں اس کی بخشش کی درخواست کرتے؟ لہٰذا آپ ﷺ نے شفاعت کو ترجیح دی۔ دوسری وجہ شفاعت اختیار کرنے کی یہ تھی کہ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنی امت کے احوال جو بعد میں پیش آنے والے تھے وہ پہلے ہی دکھلا دیئے تھے جیسا کہ اس حدیث پاک میں ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مجھے وہ احوال دکھائے گئے جو میرے بعد میری امت کو پیش ہوں گے بالخصوص ان کا ایک ودسرے کو قتل کرنا اور اس امر کا حتمی وقطعی فیصلہ علم الٰہی میں ہو چکا تھا جیسا کہ پہلی امتوں سے متعلق عذاب کے حتمی فیصلے علمِ الٰہی میں ہو چکے تھے۔لہٰذا میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ التجا کی کہ وہ مجھے میرے امت کے حق میں قیامت کے دن حقِ شفاعت عطا فرما دے۔ پس اللہ تعالی نے ایسا ہی کیا اور میری التجا قبول فرمائی۔ (المستدرک، کنز العمال)

ایک اور روایت جسے امام حاکم نے نقل کیا ہے حضرت ابوامامہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے سنا کہ آپ نے فرمایا: میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار افراد کو بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں داخل فرمائے گا۔ ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ مزید ستر ہزار کو داخل کرے گا۔ نیز اللہ تعالی اپنی مٹھیوں میں سے تین مٹھّیاں بھی جنت میں ڈال دے گا۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے حوالے سے نقل کی ہے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ امت کی ایک کثیر تعداد کو بغیر حساب کے جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ یہ حضور اکرم ﷺ کا خاص اعزاز ہے کہ اللہ تعالی نے آپ کی خاطر آپ کی امت میں سے اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کو جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمایا۔ وہ ذات خود بھی کریم ہے اور اس کا محبوب بھی کریم ہے۔ خدا خود حضور رحمت عالم ﷺ کی رضا چاہتا ہے جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا:

وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰىؕ	اور آپ کا رب عنقریب آپ کو (اتنا کچھ) عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ (الضحیٰ، ۹۳:۵)

آپ ﷺ کی اسی رضا کی خاطر اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کی کثیر تعداد کو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمایا:

صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالکؓ کی بیان کردہ روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں سب سے پہلے میں جنت کی شفاعت کروں گا۔ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے کسی بھی نبی کی اتنی تصدیق نہیں کی گئی جتنی میری تصدیق کی گئی ہے۔ انبیاء میں بعض نبی تو ایسے گزرے ہیں کہ ان کی امت میں ایک شخص کے علاوہ اور کسی نے

تصدیق نہیں کی۔(صحیح مسلم)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ حضور نبی اکرم ﷺ پہلے شفیع اور سب سے زیادہ آپ ﷺ ہی کی شفاعت قبول کی جائے گی۔مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان فضیلتوں اور عطاؤں سے نوازا ہے کہ جن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔اس کے باوجود یہ آپ ﷺ کا انکسار اور شان بے نیازی ہے کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں فخر نہیں کرتا۔یہ امت مسلمہ پر اللہ تعالی کا انعامِ عظیم ہے۔ہمیں چاہیے کہ آپ ﷺ کے امتی ہونے کے شرف پر ناز کریں اور امید رکھیں کہ آپ ﷺ ضرور روز قیامت ہماری شفاعت فرمائیں گے۔

48 حضور ﷺ کی شفاعتِ عظمیٰ کا بیان

شفاعت برحق ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ حشر کے دن تمام انبیاء علیھم السلام اور اللہ کے صالح بندے گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے جبکہ حضور سیدِ عالم ﷺ شفاعتِ کبریٰ کے اس مقام پر ہوں گے جس کا ذکر قرآن مجید میں ''مقامِ محمود'' سے کیا گیا ہے۔ شفاعت عاصیوں کی بخشش و مغفرت کے لئے اللہ تعالی کا اس امت پر خاص انعام ہے۔ حضور ﷺ نے اپنی ظاہری حیات میں بھی بہت سے صحابہؓ کی شفاعت فرمائی اور انہیں جنت کی ضمانت دی۔ میدانِ حشر میں انبیاء کرام علیھم السلام اپنی امتوں کے ہمراہ بارگاہِ محمدی ﷺ میں جمع ہو کر آپ کو اللہ تعالی کے حضور اپنا شفیع بنائیں گے۔ یہ متفق علیہ ایمان افروز حدیث جو صحیح البخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں درج ہے قارئین کی نذر ہے:

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں حضرت محمد مصطفی ﷺ نے احوالِ آخرت بتاتے ہوئے فرمایا: قیامت کے روز لوگ دریا کی موجوں کی مانند بے قرار ہونگے تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کریں گے کہ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کیجئے' وہ فرمائیں گے' میں اس کام کے لئے نہیں ہوں تم ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ! کیونکہ وہ اللہ کے خلیل ہیں۔ پس وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے جس پر وہ فرمائیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ کلیم اللہ ہیں' پس وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

خدمت میں جائیں گے' وہ فرمائیں گے کہ میں اس کام کے لئے نہیں ہوں' لیکن تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ کیونکہ وہ روح اللہ اور اس کا کلمہ ہیں۔ پس وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے وہ فرمائیں گے میں اس کام کے لئے نہیں تم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ' پس وہ میرے پاس حاضر ہو جائیں گے' تو میں کہوں گا کہ ہاں! یہ تو میرا کام ہے۔ پس (سب سے پہلے) میں اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا تو مجھے اجازت مل جائے گی اور مجھے ایسے حمد یہ کلمات الہام کئے جائیں گے جن کے ساتھ میں اللہ کی حمد وثنا کروں گا وہ اب مجھے مستحضر نہیں ہیں۔ پس میں ان محامد سے اس کی تعریف وتوصیف بیان کروں گا اور اس کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔ پس مجھے کہا جائے گا کہ اے محمد اپنا سر اٹھاؤ اور کہو کہ تمہاری سنی جائے گی' مانگو کہ تمہیں دیا جائے گا اور شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔

میں عرض کروں گا اے میرے رب! میری امت' میری امت پس فرمایا جائے گا کہ جاؤ اور جہنم سے اسے نکال لو جس کے دل میں جو کے برابر بھی ایمان ہو پس میں جا کر یہی کرونگا۔ پھر واپس آ کر محامد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرونگا اور اس کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں گا پھر کہا جائے گا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر اٹھاؤ اور کہو کہ تمہاری سنی جائیگی' مانگو کہ تمہیں دیا جائے گا اور شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کرونگا اے میرے رب! میری امت' میری امت! پس فرمایا جائے گا کہ جاؤ اور جہنم سے اسے بھی نکال لو جس کے دل میں ذرے کے برابر یا رائی کے برابر بھی ایمان ہو۔ پس میں جا کر ایسے ہی کرونگا پھر واپس آ کر انہی محامد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کروں گا اور پھر اس کے حضور سجدے میں چلا جاؤں گا۔ پس فرمایا جائے گا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنا سر اٹھاؤ اور کہو کہ تمہاری سنی جائے گی' مانگو کہ تمہیں دیا جائے گا اور شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت قبول

کی جائے گی۔ میں عرض کرونگا اے میرے رب میری امت' میری امت۔ پس فرمایا جائے گا کہ جاؤ اور اسے بھی جہنم سے نکال لو' جس کے دل میں رائی کے دانے سے بھی بہت ہی کم ایمان ہو۔ پس میں خود جاؤں گا اور جا کر ایسا ہی کروں گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں چوتھی دفعہ واپس لوٹوں گا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرونگا' پھر اس کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔ پس اللہ فرمائے گا اے محمد اپنا سر اٹھاؤ اور کہو کہ تمہاری سنی جائے گی اور مانگو کہ تمہیں دیا جائے گا اور شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کرونگا اے رب! مجھے ان کی (شفاعت کی) اجازت بھی دیجئے' جنہوں نے لا الہ الا اللّٰہ کہا ہے پس وہ فرمائے گا مجھے اپنی عزت وجلال اور اپنی کبریائی وعظمت کی قسم! میں انہیں ضرور دوزخ سے نکال دوں گا۔ جنہوں نے فقط لا الہ الا اللّٰہ کہا ہے۔''

49 اولیاء اور صالحین کا شفاعت فرمانا

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات باری تعالیٰ کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ نیک صالح مومن اپنے دوسرے بھائیوں کی شفاعت کریں گے، وہ بطور ناز اللہ تعالیٰ سے ایسا جھگڑا کریں گے جیسا کوئی شخص اپنے حق کیلئے بھی نہیں کرتا۔ ذیل میں اس ایمان افروز حدیث پاک کا متعلقہ حصہ ملاحظہ کریں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جو مومن نجات پا کر جنت میں چلے جائیں گے وہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کو جو جہنم میں پڑے ہوں گے جہنم سے چھڑانے کے لیے (بطور ناز) اللہ تعالیٰ سے ایسا جھگڑا کریں گے جیسا جھگڑا کوئی شخص اپنا حق مانگنے کے لیے بھی نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کریں گے اے ہمارے رب یہ لوگ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے، ہمارے ساتھ حج کرتے تھے، ان سے کہا جائے گا جن لوگوں کو تم پہچانتے ہو ان کو دوزخ سے نکال لو، ان لوگوں پر دوزخ کی آگ حرام کر دی جائے گی۔ پھر جنتی مسلمان کثیر تعداد میں ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لائیں گے جن میں سے بعض کی نصف پنڈلیوں کو اور بعض کو گھٹنوں تک دوزخ کی آگ نے جلا ڈالا تھا، پھر جنتی لوگ کہیں گے اے اللہ اب ان لوگوں میں سے کوئی باقی نہیں بچا جن کو جہنم سے نکال لانے کا تو نے حکم دیا تھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھر جاؤ اور جس کے دل میں ایک دینار کے برابر نیکی ہے اس کو بھی جہنم سے نکال لاؤ، پھر جنتی لوگ کثیر تعداد میں لوگوں کو دوزخ سے نکال لائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی جناب میں

عرض کریں گے ''اے اللہ! جن لوگوں کو تو نے جہنم سے نکالنے کا حکم دیا تھا ہم نے ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا''، اللہ تعالیٰ پھر فرمائے گا: ''جاؤ جس کے دل میں نصف دینار کے برابر بھی نیکی ہو اس کو جہنم سے نکال لاؤ'' جنتی لوگ پھر جائیں گے اور کثیر تعداد میں لوگوں کو جہنم سے نکال لائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے: ''اے ہمارے رب جن لوگوں کو تو نے دوزخ سے نکالنے کا حکم دیا تھا ہم نے ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔'' اللہ تعالیٰ پھر فرمائے گا: ''جس شخص کے دل میں تم کو ایک ذرے کے برابر بھی نیکی ملے اس کو جہنم سے نکال لاؤ''، جنتی لوگ پھر جائیں گے اور جہنم سے بہت بڑی تعداد میں خلقِ خدا کو نکال لائیں گے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے: ''اے اللہ اب دوزخ میں نیکی کا ایک ذرہ بھی نہیں۔'' حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر تم میری اس بیان کردہ حدیث کی تصدیق نہیں کرتے تو قرآن کریم کی اس آیت کو پڑھو۔ (بیشک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا درجہ عطا فرماتا ہے)۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک میری امت میں سے کچھ لوگ ایک گروہ کی شفاعت کریں گے اور کچھ ایک قبیلے کی اور کچھ ایک جماعت کی شفاعت کریں گے اور کچھ ایک شخص کی حتیٰ کہ وہ سب جنت میں داخل ہو جائیں گے۔''

امام ترمذیؒ کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن لوگ صفیں بنائیں گے تو دوزخیوں میں سے ایک شخص جنتیوں میں سے ایک شخص کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا: ''اے فلاں! تو یاد کر ایک دن تو نے پانی مانگا تھا اور میں نے

تجھے پانی پلایا تھا۔'' پس وہ جنتی اس دوزخی کے لئے شفاعت کرے گا۔ ایک اور آدمی دوسرے آدمی کے پاس سے گزرے گا پس وہ کہے گا: ''تو یاد کر میں نے ایک دن تجھے صفائی کے لئے پانی دیا تھا۔'' چنانچہ وہ اس کے لئے شفاعت کرے گا۔ ایک اور آدمی کہے گا: ''اے فلاں: تو یاد کر ایک دن تو نے مجھے اس اس کام کے لئے بھیجا تھا چنانچہ میں تیری خاطر چلا گیا تھا۔'' پس وہ اس کے لئے شفاعت کرے گا۔

50 اطاعتِ الٰہی اور اسلام کا تصورِ عبادت (۱)

اسلام نے عبادت کا جو تصور دیا ہے وہ بہت جامع اور وسیع ہے۔ محبت الٰہی کے بعد ایمان کامل کا تقاضا اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ایمان کے دوسرے تقاضے یعنی اطاعت الٰہی پر پوری طرح توجہ دی جائے، کیونکہ محبت درحقیقت اطاعت الٰہی کا تقاضا کرتی ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی سنن ابوداؤد میں اس طرح منقول ہے: ''جس نے اللہ کے لئے محبت کی، اللہ کے لئے دشمنی کی، اللہ ہی کے لئے روکا تو اس نے ایمان مکمل کرلیا۔''

یہی وجہ ہے کہ قرآن نازل کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ بندوں کو خدائے تعالیٰ کی مرضی اور ناپسندیدگی سے واقف کردیا جائے۔ اسی بناپر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○ (الانعام،۶:۱۵۵)	اور یہ کتاب بھی ہمی نے اتاری ہے جو برکت والی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو اور خدا سے ڈرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے۔

قرآنِ کریم کے علاوہ ہادی برحق سرورِ کائنات ﷺ کے ذریعے بھی انسان کو اچھے برے کاموں سے آگاہ کیا گیا۔ ''جس نے محمدؐ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔ جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی اور محمدؐ کی ذات گرامی اچھے اور برے لوگوں کے درمیان امتیاز کا معیار ہے۔

محبت واطاعت کا جو تصور ہمیں اسلام نے دیا وہ دوسروں سے قطعی مختلف ہے۔

اسلام ہمیں محبتِ الٰہی، احکام کی اطاعت اور اس کے مقرر کردہ ضابطوں کی پیروی و پابندی کی تلقین کرتا ہے۔قرآن کریم میں اس جامع تصور کو بیان کرنے کے لئے ارشاد ہوا ہے"اور اپنے پرورگار کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمہیں یقین حاصل ہو جائے"۔یہاں ہمیں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عبادت کا اصلی مفہوم انتہائی تذلل اور عاجزی اختیار کرنا ہے۔اسی سے ایک لفظ عبودیت بنا ہے، جس کا مفہوم ہے، انسان خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں خود کو نہایت عاجز، انتہائی مسکین، سراسر بے بس اور بے حد ذلیل سمجھے۔بارگاہ خداوندی میں اسی احساسِ بندگی کا نام عبادت ہے۔گویا یہ عبادت کا لغوی مفہوم ہوا،لیکن اس عبادت کی عملی شکل یہ ہے کہ بندہ خود کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور غلام یوں ثابت کرے کہ جس کام سے اسے منع کیا گیا ہے،اس سے عمر بھر رکا رہے اور جس کام کا اس کو حکم دیا گیا ہے،اسے ساری زندگی اسی ذوق وشوق سے کرتا رہا ہے۔خواہ وہ کرنے اور نہ کرنے والے کام مسجد اور اس کی چار دیواری سے متعلق ہوں، ہسپتال اور مدرسے کی زندگی سے متعلق ہوں،ان کا تعلق بیوی بچوں کے ساتھ سلوک سے ہو یا حکومتی اور ریاستی معاملات سے۔الغرض انسانی زندگی کے جس شعبے میں جس ڈھب سے زندگی گزارنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے،اسی طریقے سے زندگی بسر کرنے کا نام عبادت ہے۔

عبادت کے اس وسیع مفہوم سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے در حقیقت عبادت کا ایک انوکھا اور اچھوتا فلسفہ پیش کیا ہے جس کا محض مان لینا کافی نہیں بلکہ اسے ہر طرح مان کر عملی حقیقت کے طو پر اپنا لیا جائے تو ایمان مکمل ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَO

(البقرہ،۲:۳۴)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو سب سجدے میں گر پڑے۔ مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا۔

قرآن حکیم نے عبادت کے اس جامع تصور کو یوں بیان کیا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَO

(البقرۃ،۲:۱۷۷)

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب (قبلہ سمجھ کر) کی طرف منہ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر اور خدا کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال عزیز رکھنے کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں محتاجوں، اور مسکینوں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو عہد کریں، اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

51 اطاعتِ الٰہی اور اسلام کا تصورِ عبادت (۲)

جس آیت کا ہم نے سابقہ درس میں حوالہ دیا اس میں عبادت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہو یا معیشت سے، معاشرت سے ہو یا سیاست سے، حالتِ جنگ سے ہو یا حالتِ امن سے۔ گویا عبادت، اطاعتِ الٰہی کی اس کیفیت کا نام ہے جو تمام عمر کے احوال کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایمان باللہ کا تیسرا تقاضا توکل علی اللہ، یعنی ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کرنا ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ توکلِ ترک اسباب کا نام ہے، حالانکہ خدا تعالیٰ کو ایسا توکل ہرگز منظور نہیں جس میں اسباب کو مکمل طور پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام ہمیں یہ تلقین کرتا ہے کہ اسباب اور وسائل کو ضرور استعمال کریں، انہیں ضرور کام میں لائیں، مگر ہمارا مکمل بھروسہ اور اعتماد اسباب پر نہ ہو، بلکہ رب کائنات کی ذات پر ہو جو اصل اسباب کو پیدا کرنے والی ہے۔

رب المشرق و المغرب لا اله الا هو فاتخذه و كيلاO	وہی مشرق اور مغرب کا رب ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔
(المزمل، ۷۳:۹)	

قرآن حکیم نے لفظ ''وکیل'' کا مفہوم یہ لیا ہے کہ آدمی اپنے کسی کام کو نپٹانے کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص کے کندھوں پر ڈال دے۔ ہم روزمرہ زندگی میں وکیل اور وکالت کے اس تصور سے پوری طرح واقف ہیں، لیکن کیا وکیل کو کام سونپ دینے کے

بعد ہمیں غفلت کی نیند سو جانا چاہیے؟ یقیناً ہماری روزمرہ زندگی اس سوال کا جواب ''نہیں'' میں دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ موکل اپنے وکیل کی بتائی ہوئی باتوں کی پابندی کرتا ہے اور وہ اپنی بھرپور کوششیں سے معاملہ کو انجام تک لانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم یہ بھی واضح کرتا ہے کہ خدا کی ذات پر توکل کرنے والوں کو خداوند تعالیٰ ہر اعتبار سے کافی ہو جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ　　اور جو کوئی اللہ کی ذات پر بھروسا کرے گا

(الطلاق،۶۵:۳)　　تو وہ اس کو کافی ہوگا۔

جس شخص کے لئے خدا تعالیٰ کافی ہو جائے اس کی زندگی میں کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ خدا سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز مزید بہتری کی ضمانت نہیں دے سکتی۔

اللہ تعالیٰ کے کافی ہونے کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے پوری کوشش تو کرے مگر انجام کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ خداوند تعالیٰ اپنے ایسے بندے کو ضرور سرخرو فرماتا ہے۔ توکل کا یہی انداز قرآن کریم اپنے ہر پیرو میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے بغیر کسی مومن کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ توکل کرنے والے کو دنیا میں بھی بہترین پھل دیا جاتا ہے، جامع الترمذی کی ایک حدیث میں ہے: اگر تم اللہ پر توکل کرنے کا حق ادا کرو تو تمہیں ان پرندوں کی طرح جو صبح کو خالی شکم گھر سے نکلتے اور شام کو پر شکم ہو کر لوٹتے ہیں، رزق دیا جائے گا اور تمہاری دعاؤں سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے۔

(جامع الترمذی،۲:۵۷،ابواب الذھد رقم حدیث:۲۳۴۴)

ہمارے ہاں توکل کے بارے میں دو مختلف قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہمارے اس معاشرے میں دگروہ تشکیل پا گئے۔

ایک گروہ، جو جدید طرز زندگی اور مادہ پرستی کا قائل ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ سب کچھ، اسباب ہی میں ہے۔ اور اس تصور کو آگے بڑھانے میں جدید مغربی تہذیب و انداز فکر نے بہت زیادہ عملی حصہ لیا ہے اور یہ یقین بھی دلانے کی کوشش کی ہے کہ کائنات صرف اسباب ہی کے سلسلے کا نام ہے اور اسباب کے علاوہ کوئی نہیں جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔

اس غلط تصور کے نتیجے میں ہماری زندگیوں سے روحانی اثرات غائب ہو گئے ہیں اور ہم محض اسباب کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ اس طرح ہماری آنکھوں سے زندگی کا وہ رخ اوجھل ہو گیا ہے جو ان اسباب کے پیچھے ایک موثر حقیقت کے طور پر موجود ہے۔

اس گروہ کے بالمقابل دوسرا انتہاء پسند گروہ مذہبی نام لیواؤں کا ہے۔ جنہوں نے توکل کا مفہوم ترکِ اسباب سمجھ لیا اور یہ کہا کہ ہر قسم کے اسباب سے لاتعلقی اختیار کر لی جائے۔ انہوں نے انسان کو یہ تلقین کی کہ جدوجہد بیکار ہے، جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا ہے وہ تمہیں مل کر ہی رہے گا۔ ان دونوں تصورات کا اسلامی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کی تعلیمات بالکل واضح ہیں کہ جو تمہیں کرنا چاہیے اپنی طاقت کے مطابق کرتے رہو اور نتیجہ اللہ کے سپرد کر دو! یہی اصل توکل ہے۔

52 نماز کی فرضیت واہمیت

نماز اسلام کا ایک اہم بنیادی رکن ہے۔ اسلامی نظامِ عبادات میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں کم وبیش سات سو مقامات پر نماز قائم کرنے کا ذکر آیا ہے۔ جن میں سے اسی (۸۰) مقامات پر صریحاً نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے جس فرض کی ادائیگی کا حکم زیادہ تاکید کے ساتھ آیا ہے، وہ نماز ہی ہے۔

نماز وہ امتیازی عمل ہے جو ایک مومن کو کافر سے جدا کرتا ہے، قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق فریضۂ نماز کی بجا آوری میں دین کی تعمیر اور اس کے ترک کر دینے میں دین کی بربادی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا واضح ارشادِ گرامی ہے:

من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر. جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی اس نے (گویا) کفر کیا۔

(المعجم الاوسط، رقم حدیث: ۳۳۷۲)

ایک اور مقام پر اسی مضمون کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد سنن النسائی میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے ''ہمارے اور ان (غیر مسلموں) کے درمیان جو عہد ہے وہ نماز ہے۔ پس جس نے نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا یعنی عہد شکنی کی۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ توحید ورسالت کی شہادت اور اس کی عملی تصدیق کی طرف پہلا قدم نماز ہی ہے۔ نماز کا عمل ہی بندۂ مومن کو ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز کرتا

ہے۔ حضور ﷺ نے نماز کی اسی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

’’جس شخص کی نماز نہیں اس کا ایمان نہیں اور اسی طرح جس شخص کی نماز نہیں اس کا دین نہیں۔‘‘

اس ارشادِ مصطفوی ﷺ کی رو سے توحید و رسالت پر ایمان کا انحصار اس عملی شہادت پر ہے، جو بندہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد احکامِ خداوندی کی بجا آوری میں نماز ادا کرنے سے فراہم کرتا ہے۔ اس کے دعویٰ ایمان کی صداقت کا دارومدار اسی عمل کو ہمیشہ جاری رکھنے پر ہے اور اگر اسی عمل میں کوتاہی ہوگئی اور کسی نے ترکِ نماز کو اپنا شعار بنائے رکھا، اس نے عملاً اپنے دعویٰ ایمان کی نفی کر دی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تارک صلوٰۃ کا ایمان بارگاہِ خداوندی میں نامقبول اور غیر معتبر ہے۔ حضور ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی بھی اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے۔

’’آدمی اور شرک و کفر کے درمیان نماز ہی حد فاصل ہے۔‘‘

(صحیح المسلم، ۱:۸۸، کتاب الایمان، رقم حدیث:۸۲)

بندے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑنے کا فاصلہ ہے۔‘‘

(سنن نسائی، ۱:۸۱، کتاب الصلوۃ، رقم حدیث:۴۶۳)

قرآن میں جہاں جہاں ادائیگی نماز کا حکم ہوا ہے۔ وہاں نماز کی تلقین زیادہ تر ’’واقیمو الصلوٰۃ‘‘ (اور نماز قائم کرو) کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے میں کیا بنیادی فرق ہے کہ قرآن تاکید کے ساتھ نماز قائم کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔ اس کا جواب ایک حکمت پر مبنی ہے کہ اگر نماز پڑھنے کا حکم ہوتا تو زندگی بھر کے لئے ایک آدھ بار نماز ادا کر لینا ہی کافی ہوتا لیکن قرآن مجید نے بہت سی حکمتوں کی بنیاد پر نماز قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے حکم میں ہمیشگی کا پہلو ہے۔

جس کا معنی یہ ہے کہ نماز اس طرح ادا کی جائے کہ پھر اسے ترک کرنے کا تصور بھی نہ رہے۔ قرآن حکیم نے اسے ''محافظت علی الصلوٰۃ'' سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى.

سب نمازوں کی پابندی کرو اور خصوصاً درمیانی نماز کی۔

(البقرہ،۲:۲۳۸)

اقامت صلوٰۃ کے حکم کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ نماز کو تمام تر ظاہری اور باطنی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کیا جائے یعنی وہ محض رسماً نماز نہ ہو بلکہ اس کے جملہ تقاضے لفظی اور معنوی طور پر ادا کئے جائیں تا کہ اس کی روح بہر حال اس کے اندر جاری وساری رہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر نظامِ صلوٰۃ نافذ کیا جائے جس کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے میں ایک ایسا ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جائے جو معاشرے کی ہمہ جہت ترقی اور اصلاحِ احوال کا ضامن ہو۔ قرآن حکیم میں نظامِ صلوٰۃ کے نفاذ کے حوالے سے ارشادِ ربانی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُو الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُالزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○

(الحج،۲۲:۴۱)

(یہ اہل حق) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دے دیں (تو) وہ نماز (کا نظام) قائم کریں اور زکوٰۃ کی ادائیگی (کا انتظام) کریں اور (پورے معاشرے میں نیکی اور) بھلائی کا حکم کریں اور لوگوں کو برائی سے روکیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ادائیگی نماز کا حکم صرف لازم ہی نہیں بلکہ متعدی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی انسان خود نماز پڑھ لینے کے عمل سے اس فریضے کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں ہو جاتا بلکہ اس پر یہ ذمہ داری عائد کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال اور حلقۂ اثر کے سب افراد کو بھی نماز کا پابند بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اہلِ ایمان کے لئے نہ صرف حکماً بلکہ تنبیہہ کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ.	اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

(التحریم، ٦٦:٦)

حقیقی نماز وہی ہے جو انسانی زندگی میں انقلاب بپا کر دے اور اس کے اثرات معاشرے پر اس طرح مرتب ہوں کہ زندگی کے کسی گوشے میں برائی اور بے حیائی کا شائبہ تک نہ رہے۔ قرآنِ حکیم نے نماز کی اور خصوصیات کے علاوہ ایک اہم خصوصیت یہ بھی بیان کی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ .	بے شک نماز بے حیائی اور گناہ کے کاموں سے روکتی ہے۔

(العنکبوت، ۲۹:۴۵)

53 نماز کے نظامِ اجتماعیت میں مسجد کی حیثیت

مسجد اسلامی نظامِ اجتماعیت میں ایک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو مسلمانوں کو رنگ، نسل، قبیلہ، حسب ونسب اور ذات پات کی حد بندیوں سے بالاتر رکھتے ہوئے صرف ایمان کو بنیاد تسلیم کرتے ہوئے انہیں ایک ہی سطح پر لے آتا ہے جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسجد ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں یہ درس دیا جاتا ہے کہ سب انسان اولادِ آدمؑ ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں اور عملاً رنگ، نسل، قوم، زبان اور علاقہ کی کوئی حقیقت نہیں سب لوگ اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز کئے بغیر انسانی برادری کے ایک جیسے رکن ہیں۔

مگر افسوس کہ ہم اپنے کردار اور طرزِ عمل سے اس تصور کی نفی کر دیتے ہیں جس کا عملی مظاہرہ چند ساعتوں کے لئے مسجد کی چار دیواری میں تو پیش کیا جاتا ہے مگر یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم مسجد میں شانہ بہ شانہ کھڑا ہو کر محمود وایاز کا فرق ختم کرنے کا جو علامتی مظاہرہ کرتے ہیں وہ باہر آتے ہی ہمارے درمیان دولت واقتدار اور منصب وجاہ کی جو مصنوعی دیواریں حائل ہیں ان کی نظر ہو جاتا ہے۔ اس تضاد اور دورنگی نے ملتِ اسلامیہ کے اندر ہر طرف انتشار اور فرقہ پرستی کی راہیں کھول دی ہیں، جس سے امتِ مسلمہ کی

سالمیت کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔

مسجد میں انسانی مساوات کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کی عزت و تکریم اور بزرگی کا معیار صرف تقویٰ کو ٹھہرایا ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

اِنّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات، ۴۹:۱۳)	اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔

مسجد کے اندر اور باہر اسی ارشادِ ربانی کو عملی جامہ پہنانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ پھر کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ خود کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا تصور کرے۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں عالمگیر مساوات کا درس دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الا لا فضل لعربی علٰی اعجمی ولا لا لعجمی علٰی عربی ولا لاحمر علٰی اسود ولا لاسود علٰی احمر الا بالتقوی۔	جان لو کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سُرخ کو کالے پر اور کالے کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں، ہاں فضیلت اگر ہے تو وہ محض تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔

(مسند احمد بن حنبل، ۵:۴۱۱)

آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا کہ ''تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔

مسجد میں نماز باجماعت کے حوالے سے اسلام نے نظامِ اجتماعیت کے پانچ اُصول دیئے ہیں جن کو اگر معاشرے کی اصلاح کے لئے روبہ عمل لایا جائے تو ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ وہ پانچ اصول مختصراً درج ذیل ہیں۔

۱۔ انتشار کا خاتمہ: اسلام ملت اسلامیہ کو ہر قسم کے انتشار اور بدنظمی سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو لوگوں کو ٹولیوں کی

صورت میں بیٹھے دیکھا تو فرمایا کہ اگر تم اس طرح منتشر رہو گے تو تمہارے دل کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔

۲۔ملی وحدت اور استحکام: اجتماعیت کا دوسرا اُصول جو مسجد میں صف بندی اور ایک قبلہ کی طرف منہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔اسلام عملی زندگی میں بھی اسی اصول کو مسلمانوں کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔

۳۔نظم و نسق کا لحاظ: اجتماعیت صرف صف بندی ہی کا نام نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ترتیب اور قرینے کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ مسجد کے اندر اور باہر اس اُصول کو عملی جامہ پہنانا ضروری ہے تاکہ اُمت کو متحد اور منظّم رکھا جا سکے۔اس ضمن میں قرآن حکیم کا ارشاد ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور متفرق نہ ہو جاؤ'' ہمیں اسے اپنا وظیفہ حیات بنا لینا چاہیے۔

۴۔تنظیم سازی: اجتماعیت کا چوتھا اُصول تنظیم سازی سے متعلق ہے۔جس طرح نماز میں حکم ہے کہ صفِ اول مکمل ہونے تک دوسری صف نہ بنائی جائے اور صفوں میں عمر اور علمی مرتبہ کے لحاظ سے حفظِ مراتب کا خیال رکھا جائے،اس اُصول کا اطلاق مسجد سے باہر کی عملی زندگی پر بھی ہونا چاہیے۔

۵۔اہلیت: نمازِ باجماعت کی امامت کے لئے شریعتِ اسلامیہ نے ایسے شخص کو امام مقرر کرنے کی تعلیم دی ہے جو قرأت،علم،تقویٰ و طہارت کی شرائط پر پورا اترتا ہو جن کی تفصیل کتبِ فقہ میں دی گئی ہے۔اس اُصول کی رُوشنی میں یہ ضابطہ وضع کیا گیا ہے کہ امتِ مسلمہ اپنا قائد کسی ایسے شخص کو منتخب کرے جو ہر لحاظ سے قیادت کا اہل ہو۔

54 فرضیتِ رمضان اور اس کی اہمیت

رمضان المبارک کے روزے کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پالے تو وہ اس کے روزے ضرور رکھے۔

(البقرہ،۲:۱۸۵)

اس آیۂ کریمہ میں روزے رکھنے کا عمومی حکم ان ایمان والوں کو دیا گیا ہے جو اپنی زندگی میں بغیر کسی عذر یعنی بیماری کے اس ماہِ مقدس کو پالیں۔ آنحضور ﷺ نے اس ماہِ مبارک کی فضیلت کے باب میں ارشاد فرمایا:

من صام رمضان ایماناً و احتساباً غفرله ما تقدم من ذنبه جو کوئی ایمان اور احتساب سے رمضان المبارک کے روزے رکھے تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔

(صحیح البخاری،۱:۱۰،کتاب الایمان،رقم حدیث:۳۸)

اوپر درج کردہ آیہ مبارکہ اور حدیث مقدسہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روزہ ہر عاقل اور بالغ مرد وعوت پر لازم قرار دیا گیا ہے اور بغیر کسی شرعی عذر کے اس کی فرضیت سے کوئی بھی اس سے خارج نہیں البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو تو شریعت نے روزے کو مؤخر کرنے کی اجازت بھی دی ہے اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی ایسی حالت میں روزے قضا نہیں فرمائے جب آپ گھر پر قیام فرما ہوتے۔ لیکن حالتِ سفر میں آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ کبھی روز رکھ لیتے اور کبھی قضا فرما لیتے۔ یہ سب فقط امت کی تعلیم کیلئے تھا تاکہ وہ خواہ مخواہ اپنی جان کو مصیبت اور مشقت میں نہ ڈالے۔ ورنہ آپ ﷺ جو عزم و استقلال کا پہاڑ تھے کسی مصیبت کو جو چاہے کتنی بڑی ہو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن آپ ﷺ نے اپنے عمل سے امت کو ہر معاملے میں اعتدال کی تعلیم عطا فرمائی۔ یہ ہماری نا اہلی ہے کہ ہم مسائل سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے جو شریعتِ مطہرہ نے ہمیں عطا کی ہیں اس طرح ہم اپنی جان کو خواہ مخواہ مصیبت میں ڈال دیتے ہیں۔

بحالتِ قیام کسی شرعی عذر کے بغیر روزہ ترک کرنا ہرگز درست نہیں۔ تاہم سفر کے دوران یا بیماری کی حالت میں قضا کئے گئے روزوں کو باقی گیارہ مہینوں میں اگلے رمضان سے پہلے پہلے ادا کرنا ضروری ہے۔ رمضان المبارک کے دوران چھوڑے ہوئے روزوں کی ادائیگی سے غفلت احکام شریعت کی خلاف ورزی کے مترادف ہوگا۔

قرآن حکیم میں روزوں کی قضا کا حکم ان الفاظ کے ساتھ ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔

پس اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں (کے روزوں) سے گنتی پوری کرے۔ (البقرہ، ۲:۱۸۴)

ہمیں روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رمضان المبارک کے وہ روزے جو رہ جاتے تھے انہیں ماہ شعبان میں رکھ لیتی تھیں جس ماہ کے دوران کثرت سے روزے رکھنا حضور نبی اکرم ﷺ کا اپنا معمول مبارک بھی تھا۔ اس سلسلے

میں حضرت ابی سلمہ کی مشکوۃ شریف میں بیان کردہ روایت جس کے مطابق وہ فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر مجھ پر روزوں کی قضا واجب ہوتی تو میں انہیں ادا نہ کرتی یہاں تک کہ شعبان کا مہینہ آ جاتا۔ (مشکوۃ المصابیح، ۱۷۸)

حضرت عائشہؓ کے اس معمول سے یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ انہیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ ان کے روزوں کی قضا کی وجہ سے ان کے شوہر یعنی آقا ﷺ کی خدمت میں کوئی کوتاہی یا کمی واقع ہو اس لئے وہ شعبان کے مہینے تک ان کی قضا کو مؤخر کر دیتی تھیں۔ اس سے فقہا نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند کی مرضی کے بغیر نفلی روزہ نہیں رکھ سکتی۔

روزے میں سحری اور افطاری کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ روحانی فیوض و برکات اپنی جگہ مگر سحری کھانا دن میں روزے کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔ حضور ﷺ نے امت کو تلقین فرمائی ہے کہ سحری ضرور کھائی جائے خواہ پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ سحری کا کھانا آخری لمحات میں کھایا کرتے تھے جبکہ افطاری میں جلدی کرنا عمر بھر کا معمول رہا۔ اس سلسلے میں ایک حدیث ملاحظہ ہو جس کے راوی حضرت سہل بن سعدؓ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت کے لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک وہ روزہ جلد افطار کرتے رہیں گے"۔

55 روزہ اور معمولِ ختمِ قرآن

رمضان المبارک کی راتوں میں قیام کے دوران نمازِ تراویح، کثرت سے ذکر وفکر میں مشغول رہنا اور قرآن پاک کی تلاوت کا معمول اسلام کے پہلے دور سے آج تک باقاعدگی سے چلا آرہا ہے۔ رمضان المبارک کی تراویح میں کم از کم ایک بار ختمِ قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں کہ روزانہ قرآن پاک کتنی مقدار میں پڑھا جائے ائمہ اور علمائے فقہ کے مختلف اقوال موجود ہیں۔ حضرت امام اعظمؒ کی رائے ہے کہ کم از کم فی رکعت دس آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جائے۔ چونکہ قرآن حکیم کی کل آیات چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (٦٦٦٦) ہیں اور ایک ماہ میں ادا کی جانے والی تراویح کی رکعتوں کی تعداد چھ سو بنتی ہے۔ اس حساب سے اگر روزانہ دس سے بارہ آیات کی تلاوت کی جائے تو رمضان المبارک میں ایک قرآن پاک آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس سے زیادہ قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے حق میں تھے اور وہ فرماتے تھے کہ روزانہ بیس سے پچیس آیات کی تلاوت کی جائے۔ یہ آیات کی کمی بیشی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ بہر حال اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ ہمارے حفاظ و قراء کرام قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے اتنی مقدار میں نہ پڑھیں کہ ترتیل (یعنی ٹھہر ٹھہر) کے ساتھ قرآن کی تلاوت نہ کر سکیں، نہ وہ دورانِ تلاوت اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کریں کہ مقتدی اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ قرأت کو نہ سن سکیں اور ان کے پلے کچھ نہ پڑے۔ قرأت میں اعتدال اور میانہ روی اختیا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ نماز تراویح

کی جماعت میں بچے، بوڑھے اور کمزور افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے قرأت کو اتنا طول دینا ہرگز مناسب نہیں جوان کی برداشت سے باہر ہو جائے۔ اس سے ان میں بے رغبتی پیدا ہوتی ہے اور کچھ لوگ نمازِ تراویح کی طوالت کی وجہ سے جماعت کے ساتھ تراویح ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ صرف اتنی مقدار پر کفایت کی جائے کہ ہر شخص اطمینان و سکون کے ساتھ نمازِ تراویح کے دوران قرأت کو سن سکے۔

جس طرح حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تمام جہانوں کے لئے سراپا رحمت ہے۔ اسی طرح آپ کا لایا ہوا دین بھی سراسر رحمت ہے، جس پر عمل کرنا ہر فرد کے لئے سہل اور آسان ہے۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے اپنی جہالت سے دین کے معاملے میں توازن اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اور کم و بیش ہر معاملے میں افراط و تفریط پیدا کر کے اس آسان دین کو اپنے لئے مشکل بنا لیا ہے۔ رمضان المبارک میں بھی ہمارے معمولات حدِ اعتدال سے بڑھ گئے ہیں اور ہمارے اندر ایک غلط رجحان جڑ پکڑ گیا ہے جس کے تحت ہم اپنے زعم میں زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کمانے کی خاطر نمازِ تراویح میں ایک سے زیادہ بار قرآن ختم کرنے کے رجحان کو فروغ دے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے قرأت طویل ہو جاتی ہے اور کچھ مقتدی اس کے متحمل نہیں ہو پاتے۔ نتیجتاً عبادت میں ذوق و شوق پیدا ہونے کی بجائے بے رغبتی بڑھنے لگتی ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ تلاوتِ قرآن حکیم کا سننا باعثِ اجر و ثواب ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے بجائے نمازِ تراویح کے صرف خواہشمند حضرات کے لئے نوافل کی نماز کا علیحدہ اہتمام کیا جائے جبکہ عام تراویح میں صرف ایک بار قرآن سننے کے معمول کو جاری رکھا جائے اور اس کی بھی مقدار اتنی ہو کہ ہر شخص بغیر کسی دشواری کے نمازِ تراویح میں خوشدلی سے شریک ہو سکے۔

رمضان وقرآن میں گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ. رمضان کا مہینہ (وہ ہے) جس میں قرآن اتارا گیا ہے۔

(البقرہ، ۲:۱۸۵)

معمولاتِ نبوی ﷺ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضور ﷺ کا دورانِ رمضان المبارک ایک بار قرآن حکیم ختم کرنے کا معمول تھا اور آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی اسی اعتدال کی راہ پر چلنے کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے۔ اسلام ایک سادہ، قابلِ عمل اور فطرت کے قریب دین ہے اور تعلیماتِ مصطفوی ﷺ میں بھی اسی فطری سادگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے دین میں بے جا تنگی پیدا نہ کی جائے۔ اسی لئے آپ ﷺ ہر امتی کی سہولت کے لئے زندگی بھر رمضان المبارک میں ایک بار ختم قرآن کے معمول پر کاربند رہے ورنہ اگر آپ چاہتے تو پورے ماہ میں ایک ہزار بار بھی قرآن ختم کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ کے غلاموں کی یہ شان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ گھوڑے کی ایک رکاب پر پاؤں رکھتے ہوئے تلاوت شروع کرتے تو دوسری رکاب تک پورا قرآن والناس تک ختم کر ڈالتے۔

جس آقا کے غلام کی یہ شان ہو اس کی اپنی عظمت کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن آپ ﷺ کو اپنے کمزور امتیوں کا خیال تھا جن کی پریشانی اور تکلیف آپ ﷺ کو ہرگز گوارا نہ تھی۔

56 حج اور مناسکِ حج کی حقیقت

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے پانچواں رکن حج ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ حج کے تمام ارکان اور مناسک، جن کی تعظیم کا عمومی حکم دیا گیا ہے، ان کی حقیقت کو عقل کے پیمانے پر پرکھنا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ حج کے یہ معاملات عشق و محبت کی باتیں ہیں جنہیں عقل کے معیار پر پرکھا ہی نہیں جا سکتا۔ عقل تو ہر چیز کے مادی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتی ہے کہ فلاں چیز تعظیم کئے جانے کے قابل ہے یا نہیں اور اگر کوئی چیز اس کے معیار پر پوری نہ اترے تو وہ اسے سرے سے قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھتی جبکہ عشق میں چیزوں کے جانچنے اور پرکھنے کے پیمانے ہی الگ ہیں اور اس کے نزدیک مادی نسبت یا نفع و نقصان کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حج کے تمام ارکان کا تعلق شعائر اللہ سے ہے۔ عربی میں شعائر شعیر کی جمع ہے جو نشانی یا علامت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شعائر میں سب کا تعلق تاریخی اعتبار سے بعض شخصیات اور واقعات سے ہے جن کی نسبت براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ وہ تمام نسبتیں جو اللہ کے برگزیدہ بندوں انبیاء اور صلحاء سے منسوب ہیں ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے انتہائی قرب والا ہوتا ہے، تمام شعائر اللہ، خدا کے محبوب بندوں کی ادائیں ہیں جن کی تعظیم و تکریم کو قرآن نے عبادت کا درجہ دے دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

ذَالِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج‘۲۲:۳۲)

بات یہ ہے کہ جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہی بات دلوں کی پرہیز گاری سے (متعلق) ہے۔

اس آیتِ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرنے والے لوگ متقی اور پرہیز گار ہیں۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ انہیں یہ مقام ان نشانیوں کی تعظیم اوراحترام کی وجہ سے نصیب ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں احکامِ حج کے بارے میں ارشاد ہوا:

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِ عُنَّكَ فِي الْاَمْرِ (الحج‘۲۲:۶۷)

ہر امت کے لئے ہم نے عبادت کے قاعدے بنا دیئے کہ وہ ان پر چلے تو ہرگز وہ لوگ آپ سے اس معاملہ جھگڑا نہ کریں۔

اس کے ساتھ سورۃ البقرہ کی یہ آیتِ کریمہ بھی غور وفکر کا تقاضا کرتی ہے جس میں ارشادفرمایا گیا

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُوْلِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ (البقرۃ‘۲:۱۷۹)

اے عقل مندو! خون کا بدلہ لینے میں تو تمہاری زندگی (کا راز مضمر) ہے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔

اس میں قصاص کا لفظ خوں بہا کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن اس کے معنوں میں وسعت بیان کرتے ہوئے قرآن یہ فلسفہ سمجھا رہا ہے کہ جان سے گزر جانا یا موت سے کھیلنا ہی زندگی ہے۔اس فلسفۂ قربانی کو اگرچہ عقل سے سمجھنا ممکن نہیں مگر عشق کا مفتی اسی کے حق میں فتویٰ دیتا ہے کہ بقول اقبالؒ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق محبوب کے ایک اشارے پر بھڑکتی ہوئی آگ میں بے دھڑک کود جاتا ہے اور مادی نفع ونقصان کے چکروں میں نہیں پڑتا۔

حج کا عظیم اجتماع اسی فلسفۂ قربانی کی یاد دلاتا ہے جس کی بنیاد اللہ کے دو بندوں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے آج سے صدیوں پہلے ڈالی تھی۔ یاد رہے کہ ہمارے ذہنوں میں عبادت کا جو تصور ہے حج اس سے بالکل مختلف ہے۔ حرمِ کعبہ میں داخل ہوتے ہی ہم پر یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ حج روایتی طریقہ عبادت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ حاجی اپنا روزمرہ کا لباس اتار کر دو کھلی ان سلی چادریں اوڑھ لیتا ہے اور دیوانوں کی طرح ایک سیاہ رنگ کی عمارت کے گرد چکر کاٹنے لگتا ہے، اس حال میں کہ بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں اور انہیں ترشوانے کی اجازت نہیں۔ نویں ذی الحج کو بے اختیار وہ میدانِ عرفات کی طرف دوڑنے لگتا ہے' ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرتا ہے' مزدلفہ پہنچتا ہے تو مغرب کی نماز نہیں پڑھتا بلکہ عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے۔ منیٰ میں کنکریاں پکڑے ہوئے ایک گوشے میں کھڑے پتھر کے ستونوں کو شیطان سمجھ کر مارتا ہے اور آخر میں دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان تیز تیز دوڑتا ہے۔

یہ سارے معاملات عشق و دیوانگی کے ہیں' ہر عمل کے پیچھے محبت کی کوئی نہ کوئی ادا چھپی ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ کو اپنے محبوب بندوں کی یہ ادائیں اتنی عزیز ہیں کہ اس نے انہیں کے حقیقی رنگ ڈھنگ اپنا لینے کو عین عبادت قرار دیا ہے۔ حج انہی اعمال اور افعال کے مجموعے کا نام ہے۔ مناسکِ حج کا فلسفہ اور حقیقت' قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ سے جھلکتی نظر آتی ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرة،۲:۱۵۸)

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کا چکر لگائے۔

یہ سارے معاملات عشق اور جنون کی باتیں ہیں جن کے بارے میں عقل سے سوال کیا جائے تو کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ عشق سے پوچھیں تو یہی جواب ملتا ہے کہ حج کے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی ادائیں چھپی ہوئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو از حد عزیز ہیں۔

57 مناسکِ حج حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں (۱)

اگر ہم گہرائی میں جا کر مناسکِ حج کا جائزہ لیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ ارکانِ حج کا کوئی نہ کوئی تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندِ رشید حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات سے ضرور نکل آئے گا۔ مثلاً رمی یعنی کنکریاں مارنے کی رسم اس واقعہ کی یادگار ہے جب باپ بیٹا فریضہ قربانی ادا کرنے کی خاطر جا رہے تھے کہ راستے میں شیطان حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بہکانے کے لئے آ گیا اور ان سے کہنے لگا کہ تیرا باپ تجھے قتل کرنے کی نیت سے لے جا رہا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس شیطانی بہکاوے کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تو انہوں نے شیطان کو کنکریاں ماریں تاکہ اسے پتہ چل جائے کہ اس کا کوئی وار ہمارے ارادے کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کنکریاں مارنے کا فعل خدائے عزوجل کی نظر میں اتنا محبوب اور پسندیدہ ٹھہرا کہ اسے قیامت تک امتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مناسکِ حج کے طور پر عبادت کا لازمی حصہ بنا دیا گیا۔ جب تک حاجی ان علامتی شیطانوں کو کنکریاں نہ ماریں فریضۂ حج کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس فعل کا جو اس واقعے کی یادگار ہے عقل کوئی جواز نہ ڈھونڈ پائے گی۔

اس طرح لباس کا معاملہ ہے: تعمیرِ کعبہ کے وقت دونوں باپ بیٹا دو سادہ چادریں زیبِ تن کئے ہوئے تھے۔ یہ لباس جو انتہائی سادہ تھا، خدا کی ذات کو اتنا پسند آیا کہ حجاج کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا مخصوص اور علاقائی فیشن کے مطابق سلا ہوا لباس اتار پھینکیں اور فقط دو

چادریں اوڑھ لیں جنہیں احرام کا نام دیا گیا۔اب دنیا کے مختلف کونوں سے آئے ہوئے لوگ احرام کی چادروں سے جسم ڈھانپ کر سنتِ ابراہیمیؑ و اسماعیلیؑ کا اتباع کرتے ہوئے ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔گویا بقول اقبالؒ

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایسے ہی حرمِ بیت اللہ میں سب ننگے سر حاضر ہوتے ہیں، باوجود اس بات کے کہ عام حالات میں مساجد میں ننگے سر عبادت کرنا معیوب اور خلافِ سنت سمجھا جاتا ہے۔تاہم خانہ کعبہ میں جہاں خدائے بزرگ و برتر کا جلال و کبریائی اور عظمت و تمکنت اپنے عروج پر نظر آتے ہیں، ننگا سر عجز و خاکساری کی علامت ہے جو رب العزت کی نگاہِ رحمت میں انتہائی درجہ پسندیدہ عمل ہے۔

اسی طرح یہاں سر کے بالوں اور ناخنوں کا بڑھانا بھی سنتِ ابراہیمیؑ کی پیروی ہے اگرچہ ان باتوں کو عقل کے پیمانے پر پرکھنا ممکن نہیں تاہم اللہ کے مقبول بندوں سے منسوب ہونے کی وجہ سے وہ اس میں اللہ کی نظر میں اتنی پسندیدہ ہیں کہ انہیں مناسکِ حج کا درجہ عطا کر دیا گیا۔اب انہیں اپنائے بغیر حج مکمل نہیں ہوسکتا۔

کعبۃ اللہ کے گرد سات چکر لگانا جنہیں عرفِ عام میں طواف کا نام دیا جاتا ہے، جو مناسکِ حج کا اہم حصہ ہے اور حاجیوں کو حکم ہے کہ وہ پہلے تین چکروں میں دورانِ طواف اکڑ اکڑ کر چلیں۔کیا عجیب بات ہے! کہ معمول کے حالات میں اکڑ کر چلنا اور اترانا غرور و تکبر اور سرکشی کی علامت ہے جو اللہ کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ افعال ہیں۔لیکن حج میں معاملہ کچھ اور ہے۔

روایات کے ذریعے ہم تک اس کی جو حکمت پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ جب مسلمان

ہادیِ برحق ﷺ کے حکم کے مطابق مکہ سے مدینہ ہجرت کر چکے تو مسلسل جہاد اور ریاضت و مشقت کی بناء پر ان کے جسم دبلے اور کمزور پڑ گئے تھے۔ جب صلح حدیبیہ کے بعد مدینے سے عمرہ کرنے کے لئے مکہ پہنچے تو ان کی چال ڈھال سے کمزوری کا اظہار ہوتا تھا۔ طوافِ کعبہ کے دوران انہیں آہستہ آہستہ چلتے دیکھ کر کفارِ مکہ طعنہ زنی کرنے لگے کہ مسلمان مکہ میں تو کھاتے پیتے اور خوشحال تھے مدینے جا کر ان کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا۔ حضور ﷺ کو کافروں کی اس طعنہ زنی کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کافروں کی بات غلط ثابت کرنے کے لئے طواف کے دوران اکڑ اکڑ کر اور کندھے مٹکا مٹکا کر چلیں۔ اس وقت سے یہ انداز مناسکِ حج میں شامل ہو گیا۔ اگرچہ اس کے بعد معاملے کی وہ صورت باقی نہ رہی اور سرزمینِ حرم کو کفار و مشرکین کے وجود سے خالی ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔

58 مناسکِ حج حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یادگاریں (۲)

حرمِ کعبہ میں وہ مقام جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کے قدم مبارک لگے تھے اسے نماز کے لئے خاص کرنے اور جائے نماز بنانے کا حکم ہوا جیسا کہ اہلِ ایمان سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى — اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ۔

(البقرہ،۲:۱۲۵)

اب جب تک حکمِ خداوندی کے تحت اس مخصوص مقام پر دو رکعت نماز نہ ادا کی جائے طوافِ کعبہ کی تکمیل نہیں ہوتی اور حج نامکمل رہتا ہے۔ یوں تو حرم کی ساری زمین مقدس و محترم ہے لیکن اللہ کو اس جگہ سے جہاں اس کے خلیل کے قدموں نے مس کیا تھا اتنی محبت ہوگئی کہ وہاں ساری خدائی کو سجدہ کرنے کا حکم مناسکِ حج کا حصہ بن گیا۔

دنیا کے لاکھوں پہاڑوں میں سے صرف صفا و مروہ کو خدا کی نشانیاں (شعائر اللہ) قرار دینے کی کیا حکمت ہے؟ اس کے پیچھے وہ داستان ہے جس کا مرکزی کردار حضرت اسماعیلؑ کی والدہ اور حضرت ابراہیمؑ کی چہیتی بیوی حضرت ہاجرہؓ ہیں جنہیں حضرت ابراہیمؑ حکمِ خداوندی کے مطابق اس ویران وادی میں چھوڑ کر چلے گئے۔ جب کہ سیدنا اسماعیلؑ ابھی شیر خوار ننھے سے بچے تھے اور انہیں جب شدت کی پیاس محسوس ہوئی تو ماں کی مامتا بے قرار ہوگئی اور حضرت ہاجرہؓ اپنے لختِ جگر کو زمین پر لٹا کر دونوں پہاڑوں کے درمیان پانی

کی تلاش میں دیوانہ وار دوڑنے لگیں کہ شائد کہیں سے پانی کا چشمہ مل جائے۔ اس اضطراب و پریشانی کی کیفیت میں انہوں نے کئی چکر لگائے۔ وہ اس خیال سے بچے کو اپنی نگاہ سے اوجھل بھی نہیں رکھنا چاہتی تھیں کہ کہیں کوئی بھیڑیا وغیرہ انہیں اٹھا کر نہ لے جائے۔ خدائے ذوالجلال کو اپنی اس پیاری بندی کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کو مناسکِ حج میں شامل کر کے رہتی دنیا تک ہر عازمِ حج کے لئے لازم قرار دے دیا۔

اس داستانِ خوش انجام کا اختتام اس طرح ہوا کہ کم سن اور نونہال اسماعیلؑ نے پیاس کی شدت سے زمین پر ایڑیاں رگڑنا شروع کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھریلی زمین کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری کر دیا جو ہزاروں سال گزر جانے کے بعد آج بھی جاری ہے اور ایک جہان اس سے سیراب ہو رہا ہے۔ یہی چشمہ زم زم کے نام سے ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

یوں تو دنیا میں ہر جگہ اللہ کے نام پر صدقہ وخیرات کے لئے جانور ذبح کئے جاتے ہیں لیکن ذبیح اللہ حضرت اسماعیلؑ سے نسبت ہونے کی بناء پر مقام منیٰ پر جو قربانی کے لئے ذبح کئے جانے والے جانوروں کی حیثیت منفرد اور جداگانہ ہوگئی وہ کسی اور کی نہیں ہے اور انہیں اسی خاص نسبت سے شعائر اللہ کا درجہ دے دیا گیا۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ

ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے اللہ کی نشانیوں سے کیا۔

(الحج، ۲۲:۳۶)

اس طرح حجرِ اسود اپنی نوعیت کے اعتبار سے عام پتھروں کی طرح ایک پتھر ہے لیکن چونکہ اسے آقائے نامدار ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے حرمِ کعبہ کے اندر نصب فرمایا اور اپنے مقدس لبوں سے اسے بوسہ دیا، اس لئے حجرِ اسود کو اس نسبت سے دنیا کے تمام

پتھروں پر فضیلت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ حجرِ اسود کا احترام اور اسے بوسہ دینا شاملِ مناسکِ حج ہے۔

حرفِ آخر

اگر ہم غور کریں تو مناسکِ حج کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شریعت مطہرہ نے عبادت کے ذیل میں دو قسم کے اعمال بیان کئے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ اعمال آتے ہیں جو فی نفسہٖ عبادت قرار دیئے گئے جیسے نماز روزہ وغیرہ۔ دوسری قسم میں وہ اعمال شامل ہیں جو ہر چند اپنی ظاہری نوعیت کے اعتبار سے عبادت کے درجے میں نہ تھے لیکن انہیں اللہ کے مقبول اور برگزیدہ بندوں سے منسوب ہونے کی وجہ سے خدا کی نظر میں محبوبیت کا وہ مقام مل گیا کہ انہیں اللہ کے حکم کے تحت دہرائے جاتے رہنا عین عبادت قرار پایا۔ اور تمام مناسکِ حج کا یہی فلسفہ اور یہی حقیقت ہے۔ عقل اور منطق سے ان کی حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچا جا سکتا اس لئے عقلی کہ مقبولانِ الٰہی کے انداز و اطوار اور محبوبانہ ادائیں عشق و مستی اور وارفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ مناسکِ حج کے ضمن میں شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کے تقویٰ کا موجب ہوتی ہے۔ لہٰذا عقلی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ان کے آگے فرطِ ادب سے سرِ تسلیم خم کر دینا ہی مناسکِ حج کا تقاضائے اولین ہے۔

59 زکوٰۃ کی فرضیت واہمیت

نماز کے بعد دوسرا اہم ترین رکن زکوٰۃ ہے جس کا حکم بیاسی مقامات پر قرآن حکیم میں وارد ہوا ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حضور ﷺ کے وصال کے بعد سرزمینِ عرب میں ہر طرف فتنے سر اُٹھانے لگے اور اسلامی ریاست کو سنگین ترین آزمائش اور بحرانی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، تو سب سے بڑا چیلنج منکرینِ زکوٰۃ کی طرف سے تھا۔ اسلامی تاریخ کے اس انتہائی نازک لمحے میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام وقتی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کمال جرأت ایمانی سے اس بات کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا کہ جو کوئی نماز اور زکوٰۃ میں کسی قسم کی تفریق اور امتیاز کرے گا میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ چنانچہ خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فتنہ بپا کرنے والے باغیوں کے خلاف کھلم کھلا جہاد کیا اور ان کی تلوار اس وقت تک میان میں نہیں آئی جب تک منکرینِ زکوٰۃ کی پیدا کی ہوئی شورش اور سازش ختم نہیں ہوگئی۔

قرآن حکیم نے اسلامی ریاست میں صاحبانِ اقتدار و اختیار کے منصبی فرائض گنواتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ	(یہ اہلِ حق) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دے دیں (تو) وہ نماز (کا نظام) قائم کریں اور زکوٰۃ کی

الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِO
(الحج،۲۲:۴۱)

ادائیگی (کا انتظام) کریں اور (پورے معاشرے میں نیکی اور) بھلائی کا حکم کریں اور (لوگوں کو) برائی سے روک دیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اس آیتِ کریمہ کی رو سے اسلامی حکومت کے قیام کے چار بنیادی مقاصد میں سے دوسرا اہم مقصد ایتائے زکوٰۃ یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ جب اسلامی حکام منصبِ حکومت پر فائز ہوں تو اُن کے لئے لازم آتا ہے کہ وہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے کے بعد نظامِ زکوٰۃ کا قیام بھی عمل میں لائیں۔ ایسا کر لینے کے بعد ہی تیسرا اور چوتھا فریضہ یعنی معاشرے میں معروف (نیکی) کا حکم دینا اور منکر (برائی) کو روکنا اربابِ حکومت پر عائد کیا گیا ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ نظامِ صلوٰۃ نافذ کرنے سے اسلامی معاشرہ روحانی برکات وثمرات سے فیض یاب ہوتا ہے اور حقوق اللہ کی ابتداء بھی نظامِ صلوٰۃ سے ہوتی ہے لیکن چونکہ زکوٰۃ کا تعلق اقتصادیات سے ہے اس لئے اسلام کے معاشی نظام میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ زکوٰۃ کے حکم کے پیچھے ایک بہت بڑی حکمت کارفرما ہے کہ اسلامی حکومت پورے معاشرے کو ایسا معاشی نظام، طرزِ زندگی اور سماجی ڈھانچہ مہیا کرے، جس سے حرام کمائی کے سارے ذرائع اور راستے ختم ہو جائیں اور رزقِ حلال کے دروازے خود بخود کھلتے چلے جائیں۔ اس لئے شریعت نے ہر صاحبِ مال پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ سالانہ بنیادوں پر اپنے جمع شدہ مال میں سے اڑھائی فیصد نکال کر اجتماعی طور پر بیت المال یعنی حکومت کے خزانے میں جمع کرا دے تا کہ اُسے معاشرے کے محتاج افراد کی

ضروریات پوری کرنے کے لئے خرچ کیا جاسکے۔ اگر اس شرح سے استطاعت رکھنے والے سب افراد اپنے سال بھر کے جمع شدہ زرومال سے اپنا اپنا حصہ نکالتے رہیں تو نہ صرف اس طرح ان کی کمائی حلال اوران کا مال آلائشوں سے پاک وصاف ہوجائے گا بلکہ معاشرہ میں پائی جانے والی ناہمواریاں خود بخود دور ہوتی رہیں گی۔ اگر افرادِ معاشرہ کے قلب و باطن میں یہ سوچ جاگزیں ہوجائے تو نہ صرف پوری معاشرتی زندگی حلال وحرام کی حدوں سے آشنا ہوجائے گی بلکہ اجتماعی احوال ومعاملات بھی سنور جائیں گے۔

نیکی کا یہ تصور کہ محض، نماز، روزہ اور نفلی عبادات سے ہمارے زندگی بھر کے گناہ دُھل جاتے ہیں، خام خیالی کے سوااور کچھ نہیں۔ یہ تصوراسلامی نظام کی عمارت کوکھوکھلا کرنے کا باعث بن رہاہےاور یہ ایک ایسا تصور ہےجس کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔اس قسم کی کوئی تعلیم جناب رسولِ کریم ﷺ نے ہمیں نہیں دی نہ ہی سیدنا غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے دی ہے جن کے نام پر ہم گیارہویں کا اہتمام کرتے ہیں۔

نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ زکوٰۃ کے بنیادی مقاصد میں ایک سے انسان کی روحانی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں تو دوسرے سے اس کی مادی ضرورتوں کی تکمیل کی ضمانت میسر آتی ہے۔گویا ایک صحیح اسلامی معاشرہ، روحانی اور مادی تقاضوں کے پورا ہونے کے بعد ہی وجود میں آتا ہے۔اس ضمن میں یہ نکتہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ ''امر بالمعروف'' کا تعلق نظامِ صلوٰۃ سے ہےاور ''نہی عن المنکر'' کا تعلق نظامِ زکوٰۃ سے ہےاور جب تک یہ دونوں نظام اپنی پوری رُوح کے ساتھ نافذ نہ ہوں گے اسلامی معاشرے کے قیام کا خواب اس وقت پورا نہ ہوسکے گا۔

60 انفاق فی المال کی حقیقت

''انفاق فی المال'' سے مراد اپنے سرمایہ اور مال و دولت کو دوسروں پر اس طرح خرچ کرنا ہے کہ ان کا معاشی تعطل ختم ہو جائے اور وہ معاشرے میں اپنا مطلوبہ کردار بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔ تاریخِ اسلام میں ہمیں اس انفاق کی عملی مثال ''مواخات مدینہ'' میں نظر آتی ہے اور فعلِ احسان کی اگر عملی صورت دیکھنی ہو تو وہ اسی قسم کے انفاق میں دیکھی جاسکے گی۔

انفاقِ مال کا عمل دو سطحوں پر ہوسکتا ہے: انفرادی سطح اور اجتماعی سطح، انفرادی سطح پر انفاق سے مراد یہ ہے کہ افراد اپنے طور پر اپنے حلقہ اثر میں اس شخص کو جو معاشی مشکلات کا شکار اور ضروریات زندگی سے محروم ہو کر معاشرے کا ناکارہ عضو بن کر رہ گیا ہو اس کی اور اس جیسے دوسرے ضرورت مند افراد کی مالی مدد اس انداز سے کریں کہ ان کی عزت نفس بھی برقرار رہے اور ان کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں، یہاں تک کہ وہ کسی اور کے محتاج نہ رہیں بلکہ ان کی زندگی سے معاشی تعطل اس طرح ختم ہو جائے کہ وہ معاشرے میں باعزت شہریوں کی طرح تعمیری کردار ادا کرسکیں اور وہ اس پوزیشن میں آ جائیں کہ انہیں ان کا صحیح مقام مل جائے۔ اس سلسلے میں قریبی رشتے دار اور پڑوسیوں کے علاوہ وہ لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خدمتِ اسلام کے لئے اس طرح وقف کر دیا ہو کہ روزی کمانے کی ان میں فرصت ہی باقی نہ رہی ہو۔ ان میں وہ مجاہدین بھی آتے ہیں جو اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور انقلابی تحریکوں کے دست و

بازو بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ معاشی تعطل کا شکار ہو گئے تو دینِ حق کے غلبے اور احیائے ملت کی خاطر ہونے والی جدوجہد معطل ہو کر رہ جائے گی۔ قرآن حکیم میں اس بارے میں یوں ارشاد ہوا ہے۔

لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُO وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْO وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہ وَمَا تُنْفِقُوْامِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَO لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًاO وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌO اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّھَارِ سِرًّا وَ عَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

(البقرہ،۲:۲۷۲،۲۷۴)

ان کو منزل مقصود تک پہنچانا آپ کے ذمے لازم نہیں (بلکہ آپ کے ذمے تو صرف رہنمائی کر دینا ہے) ہاں اللہ جسے چاہتا ہے منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ تم اگر کوئی اچھی چیز خرچ کرو تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور تمہیں (کسی اور مقصد کے لئے) مال خرچ کرنا مناسب نہیں۔ ہاں مگر صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لئے انفاق کرو۔ تم جو کچھ بھی انفاق کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا نتیجہ اور ثمرہ ملے گا۔ (انفاق کرو) ان فقراء کے لئے جو راہِ خدا کے اسیر ہیں (وہ دینِ حق کی خدمت میں اس قدر مصروف ہو گئے ہیں کہ) وہ زمین میں کاروبارِ حیات کے لئے چلنے پھرنے کا وقت بھی نہیں پاتے، نادان لوگ انہیں عزتِ نفس کے باعث سوال سے بچنے کی وجہ سے (مغالطے کا

شکار ہو کر) مال دار سمجھتے ہیں۔تم انہیں
ان کی صورت سے پہچان لو گے۔ وہ
لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں
کرتے کیونکہ اس طرح ان کی عزتِ
نفس مجروح ہوتی ہے ۔تم جو کچھ بھی
انفاق کرو گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اسے
جانتا ہے۔ جولوگ راتوں کی تاریکی میں
اور دن کے اُجالے میں یا چھُپے اور ظاہر
دوسروں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ان
کے لئے ان کا اجراء اور صلہ ان کے رب
کے پاس ہے۔(وہ یہ خوشخبری ابھی سُن
لیں کہ ایسا کرنے والوں کو) نہ کوئی خوف
دامنگیر ہوگا اور نہ کوئی حُزن وملال۔

اجتماعی سطح پر ''انفاق'' سے مراد یہ ہے کہ عملِ انفاق ایک ایسے نظام کے طور پر رائج کیا جائے کہ معاشرے کا کوئی فرد حاجت مندی اور معاشی تعطل میں مبتلا نہ رہے۔اس طرح جو معاشرہ جنم لے گا وہ معاشی استحکام سے ہمکنار ہو کر قومی نصب العین حاصل کرنے کے لئے اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کر سکے گا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ قومی نصب العین کے حصول کے لئے لائحہ عمل تین بنیادی شعبوں یعنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے باہمی ربط وتعلق سے وجود میں آتا ہے۔ یہ نصب العین غلبۂ حق کے لئے عالمگیر سطح پر ایک صالح معاشرے کا قیام ہے۔جس کی خاطر عالمگیر مصطفوی انقلاب بپا کرنا وہ قومی

مقصد ہے جو ہر سطح پر سیاسی ظلم اور جبر کے خاتمے، معاشی ناانصافی کے خاتمے اور معاشرتی ناہمواریوں کے خاتمے سے عبارت ہے۔ لہٰذا اجتماعی انفاق کا عمل اسی وقت پروان چڑھ سکتا ہے جب ہمہ گیر سیاسی، معاشی اور سماجی انقلاب کے ذریعے ایک ایسا صالح اور مثالی معاشرہ وجود میں لایا جائے جو ہر قسم کے جبر اور استحصال کو جڑ سے اکھاڑ دے۔ قرآن حکیم نے اس مثالی معاشرے کی نشان دہی ہجرتِ مدینہ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نئی زندگی اور ان کی سابقہ زندگی کے حوالے سے کی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

وَاذْكُرُوْا اِذْاَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(الانفال، ۲۶)

اور یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے۔ معاشی طور پر کمزور اور غیر مستحکم تھے (اور) تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں طاقتور لوگ تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ پس اس نے تمہیں آزاد ٹھکانہ عطا کیا اور اپنی مدد سے تمہیں تقویت بخشی اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بن سکو۔

61 جہاد بالمال کا قرآنی تصور

قرآنِ حکیم میں آیاتِ جہاد میں مال کے ساتھ جہاد کرنے کو پہلے درجے پر بیان کیا گیا ہے اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کا ذکر دوسرے درجے پر رکھا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی یہ ترتیب اور اسلوبِ بیان اس نکتے کی تعلیم دے رہا ہے کہ جہاد کا آغاز جہاد بالمال سے کیا جائے۔ جہاد بالمال کا مفہوم یہ ہے کہ اس مال میں سے جو تم کماتے ہو اپنی ذاتی ضروریات سے بچا کر اللہ کی راہ میں اس کی مخلوق کے دکھوں کے علاج اور ان کی بہتری کے لئے خرچ کر دو۔ یہ مال آپ کے پاس اللہ کی امانت ہے، اسے فضول خرچی، عیاشی اور نام و نمود ہی کی نذر نہ کر دو بلکہ اوروں کے حقوق ادا کرنے اور محتاجوں کی ضروریات کی کفالت پر خرچ کرنا اپنا روزمرہ کا معمول بنا لو۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے قرآن حکیم کے حکم کی تعمیل میں جہادی زندگی کا آغاز کر دیا۔

تقویٰ کے بارے میں قرآنِ حکیم یہ تصور انسانی ذہن میں بٹھانا چاہتا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے اور نماز کی ادائیگی کے بعد مال خرچ کرنا شرط ہے جس پر پورا اتر کر ہی یہ قرآن متقیوں کے لئے ہدایت بنتا ہے۔ سورہ فاتحہ کے بعد قرآن تعلیمات کا آغاز ہی اس نکتے سے ہو رہا ہے۔ سورہ بقرہ میں ''ھدی للمتقین'' کہہ کر قرآن نے متقین کا لفظ استعمال کیا، اس کے ساتھ مال خرچ کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝ (البقرہ، ۲:۳)	جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور (یہ وہ لوگ ہیں) جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

جہاد بالمال کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن حکیم نے ایک مقام پر اللہ

کی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو سب سے بڑا متقی کہا ہے اور اس کا یہ عمل اسے دوزخ کی آگ سے نجات کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ قرآن کی نظر میں ایک متقی کی تعریف ہے تو اس کے برعکس وہ شخص جو مال و دولت سمیٹ کر رکھے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بجائے اس پر سانپ بن کر بیٹھ جائے تو پھر ایسا بخیل دوزخ کے عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس تصور کی وضاحت قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر یوں کی گئی ہے۔

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ○ كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ○

(التوبہ، ۹:۳۴)

جو مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو دنیا میں ہمیشہ رکھے گا ہرگز نہیں وہ یقیناً روند ھنے والی میں ڈال دیا جائے گا اور آپ کیا جانیں کہ وہ روند ھنے والی کیا ہے (وہ) اللہ کی آگ ہے جو (اس کے حکم سے) سلگا دی گئی ہے۔

مال و دولت کو جمع رکھنے والا ہرگز یہ گمان نہ کرے کہ وہ بھڑکتی ہوئی دوزخ کی آگ سے بچ جائے گا۔ ہرگز نہیں وہ ہوس زدہ لوگ جو سونا چاندی مال و دولت کو اپنے پاس جمع کر کے رکھتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) سے ہاتھ روکے رکھتے ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم میں یہ کڑی وعید ہے۔

الَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ○

(التوبہ، ۹:۳۴)

جو لوگ سونا، چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔

مال کے ساتھ جہاد کو نفس کے ساتھ جہاد پر کیوں مقدم کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے

کہ جان سے جہاد کرنے کا موقع کبھی کبھار ملتا ہے لیکن اس کے برعکس اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے مواقع کثرت سے میسر آتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تلقین فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں جو مال عطا کیا ہے اس میں صرف تمہارا حق نہیں بلکہ ہمارے ان بندوں کا حق بھی ہے جو اس سے محروم ہیں اور ان کی غربت اور افلاس کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک وقت کی روٹی کو بھی ترستے رہتے ہیں۔ مالی جہاد سے انسان کو ساری زندگی واسطہ پڑتا ہے جس میں دکھی انسانیت کی خدمت کے بے شمار مواقع میسر آتے ہیں جبکہ راہِ حق میں جان قربان کرنے کا موقع زندگی میں ایک آدھ بار آتا ہے۔

جہاد بالمال کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم نے جہاد کے معاملے میں اسی لئے اسے اولیت عطا کی ہے۔ افلاس، غربت اور احتیاج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جس کو حل کئے بغیر فلاحی معاشرے کے قیام کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نظام ایک ایسے معاشرے کی تعمیر چاہتا ہے جو افراط و تفریط، مصنوعی نسلی امتیاز اور طبقاتی گروہ بندیوں سے پاک ہو اور جہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر نہ ہوتے جا رہے ہوں۔ یہی وہ نظام ہے جو بقول حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ ایک بہتر نظام ہے۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

62 جہاد کے بارے میں قرآن کا عملی تصور (۱)

جہاد کا مفہوم سمجھانے کے لئے قرآن نے جہاد کے مقابلے میں 'قعود' کا لفظ استعمال کیا ہے جو جہاد کا الٹ (ضد) ہے اور جس کا معنی غفلت اور سستی کے ساتھ بیٹھ رہنا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ	وہ لوگ جو بے عذر (گھر میں) بیٹھے
الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ	رہتے ہیں (جہاد سے جان چراتے ہیں)
وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنے مال اور
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ۔	جان سے جہاد کرتے ہیں وہ (دونوں)
(النساء، ۴:۹۵)	برابر نہیں ہو سکتے۔

قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ ترکِ جہاد غفلت کا پیش خیمہ ہے۔ اسی لئے جہاد کرنے والے کو 'مجاہد' اور اسے جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے 'قاعد' کے القاب سے پکارا گیا۔ قاعد (بیٹھے والے) وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چراتے ہیں اور اس موہوم اور ہلکی سی امید پر غفلت سے بیٹھے رہتے ہیں کہ ہمارا حال خود بخود سنور جائے گا۔ قرآن کے الفاظ میں بیٹھے رہنے والے اور جہاد کرنے والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ گویا جہاد کرنا اور بیٹھے رہنا دو مختلف کیفیتوں کا نام ہے۔ قرآن کی رو سے جہاد اس عمل کا نام ہے جس میں انسان اپنے اوپر غفلت اور تساہل کو حرام قرار دیتا ہے اور ہر وقت دوڑ دھوپ اور محنت و

مشقت سے کمرِ ہمت باندھے رہتا ہے۔اس دھن میں سرشار ہوکر اللہ کا بندہ دن رات کے آرام اور چین کو اللہ کے دین کی خاطر قربان کر دیتا ہے اور مجاہدانہ انقلابی زندگی میں مگن رہتا ہے۔

اس قرآنی تصور کے مطابق اللہ کے دین کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہنے کا نام جہاد ہے اور یہ عمل مسلسل جدوجہد، سعی و کاوش اور انسانی زندگی کے ریشے ریشے میں اتر جانے والی تپش وحرات سے عبارت ہے۔ جہاد وہ کیفیت ہے جو انسان پر سونا کھانا پینا اور عیش و آرام کو حرام کر دیتی ہے اور اس سے سکھ چین دور کر کے اسے بے قرار اور سراپا اضطراب بنا دیتی ہے۔

یاد رہے کہ اگر امتِ مصطفوی ﷺ کو تباہی و ہلاکت کے گڑھے میں گرتا دیکھ کر کسی کا دل تڑپ اور کسک سے بیگانہ رہے، اس کی راتوں کی نیندیں نہ اجڑیں اور آنکھوں کے پیمانے نہ چھلکیں تو وہ ایمان اور جہاد سے کوسوں دور ہے اور اس کا دینِ مصطفی ﷺ سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں، وہ مسلمانی کے تصور سے بھی کوسوں دور ہے۔ جب ہم قرآن حکیم سے پوچھتے ہیں کہ جہاد کی زندگی اپنانے والوں کو بارگاہِ حق سے کیا نصیب ہوتا ہے تو اللہ رب العزت کی طرف سے ہمیں جواب ملتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔	اور جو لوگ ہماری راہ میں (ہمارے لئے) کوشش کرتے ہیں ہم ضرور اپنے راستے انہیں دکھا دیتے ہیں۔
(العنکبوت،۲۹:۶۹)	

یعنی وہ لوگ جو ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں، دوڑ دھوپ اور محنت ومشقت ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے، ہم مایوسیوں، پریشانیوں اور بے یقینیوں کے درمیان سے ان کے لئے راستے نکال دیتے ہیں۔

اس ضمن میں غزوۂ بدر کا حوالہ دیا جاتا ہے۔میدانِ جنگ گرم ہے،صحابہ کرام رضی اللہ عنہ جہاد میں مصروفِ عمل ہیں۔ان کی بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ بعض کے پاس تلواریں نہیں۔ان کے ہاتھوں میں درختوں کی چھڑیاں تھما دی گئی ہیں اور یہ قلیل اسلحۂ جنگ رکھنے والی تین سو تیرہ مجاہدوں پر مشتمل مختصر جماعت ہزار سے بھی زائد کفار کے سامنے صفیں باندھے کھڑی ہے جو سر سے پاؤں تک اسلحہ سے لیس ہیں۔

جنگ کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ کر اپنے اختتام کو پہنچی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے لگے۔آقا: یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے ہاتھوں میں بعض کے پاس چھڑیاں اور کسی کسی کے پاس تلواریں تھیں ہم کفار کی طرف مقابلے کے لئے لپکتے تھے اور ابھی ہمارا ہاتھ اوپر ہی ہوتا تھا کہ ہمارے سامنے آنے والے کافر کا سر قلم ہو جاتا تھا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ارشاد فرمائیں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کے لئے فرشتے بھیج دیئے تھے جو جہاد میں ہمارے ساتھ شریک ہو کر کافروں پر موت بن کر ٹوٹ پڑے تھے۔

آج بھی اگر بدر کی سی فضا اور ماحول پیدا ہو جائے تو قادرِ مطلق سے کوئی بعید نہیں کہ وہ اپنے دین کی مدد کے لئے غیب سے نصرت کا سامان پیدا فرما دے۔کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اگر زندگی سراسر جہاد بن جائے تو پھر کامرانیوں اور کامیابیوں کا پیدا کرنا اللہ رب العزت اپنے ذمۂ کرم پر لے لیتا ہے۔

63 جہاد کے بارے میں قرآن کا عملی تصور (۲)

جہاد جسے مسلسل عمل سے تعبیر سے کیا گیا ہے شریعت اسلامیہ کی رو سے اس کی پانچ قسمیں ہیں۔

۱۔ جہاد بالعلم ۲۔ جہاد بالعمل ۳۔ جہاد بالمال

۴۔ جہاد بالنفس ۵۔ جہاد بالقتال

نفس، انسان کے اندر بہت بڑا شیطان ہے جس کی سرکوبی کئے بغیر مرد، مرد کہلانے کا حق دار نہیں، نفس کے شر اور فتنے سے باخبر کرنے کے لئے ایک دفعہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے پوچھا۔

''پہلوان کون ہوتا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے،'' آقا جو میدان میں دوسرے کو پچھاڑ دے'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''پہلوان وہ ہوتا ہے جو غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو پائے۔'' (صحیح المسلم ،۲: ۳۲۶، کتاب البر والصلہ ،رقم حدیث: ۲۶۰۹)

گویا آقائے دوجہاں ﷺ کے فرمان کے مطابق 'پہلوان' کہلانے کا حق دار وہی ہے جو اپنے نفس کو اپنے قبضہ میں لے اور اسے مغلوب کردے۔ اللہ کا بندہ اپنی نفسانی خواہشات کے تابع نہیں ہوسکتا۔ اس صورت میں اس کا من مشرک ہے، اگرچہ وہ زبان سے ہزار توحید کے نغمے گاتا پھرے۔ وہ شخص جو زبانی توحید کا پرچار کرتے نہیں تھکتا مگر اس کا من نہ صرف دنیاوی شہرت، جاہ وعزت اور ناموری کا پجاری ہوتا ہے بلکہ وہ مال و دولت اور تکبر ورعونت کے بت کے آگے اپنی پیشانی خم کردیتا ہے، وہ خدائے واحد کا پرستار ہونے کے دعوؤں کے باوجود باطنی طور پر مشرک ہی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

اَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰئہُ۔ کیا آپ نے دیکھا اسے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے۔ (الفرقان، ۲۵:۴۳)

یہ دنیا کا پجاری شخص باتیں تو توحید کی کرتا ہے لیکن اس نے اپنے من میں پلنے والی نفسانی خواہشات کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے۔ اگر محض سر اللہ کی بارگاہ میں جھکا رہا ہو اور دل میں خواہشوں اور آرزوؤں کے بت سجا رکھے ہوں تو ایسا شخص داخلی مشرک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ اس وقت تک ہرگز ہرگز نہیں بن سکتا جب تک وہ ان نفسانی خواہشات کے بتوں کی پوجا نہ چھوڑ دے اور اس کا دل حرص و ہوا سے پاک نہ ہو جائے۔ اگر بندہ صرف اللہ کا ہو جائے تو وہ اپنے گلے میں باطل و طاغوت کی بجائے اللہ اور اس کے رسولِ مقبول ﷺ کی بندگی کا پٹہ ڈال لیتا ہے اور پھر جب وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنا سر جھکاتا ہے تو بقول اقبالؒ اس کا حال اس شعر کا عملی نمونہ ہو جاتا ہے:

؎ وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

انسان کا نفس بہت سرکش ہے اور اسے کچلنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس کو اپنے ماتحت اور قبضہ میں کرنے کو جہادِ اکبر قرار دیا ہے۔ کنز العمال اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں یہ روائت مذکور ہے کہ ایک جنگ سے لوٹتے وقت حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

حدیثِ مبارکہ کے الفاظ ہیں:

رَجعنا مِن الجِهَاد الاَصغرالی الجِهَاد الاکبَر.

ہم جہاد اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے۔

(الدررالمنتثرہ ۸۹:)

(تاریخ بغداد،۱۳: ۴۹۳)

روایت بتاتی ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا حضور! یہ جہادِ اکبر کیا ہے؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضاحت کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ چھوٹا جہاد کافروں سے جنگ کرنا ہے جب کہ بڑا جہاد (جہادِ اکبر) اپنے اندر کے کافر (نفس) سے جنگ کرنا ہے۔

یہاں ایک نکتہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جولوگ جہادِ اصغر میں مارے جاتے ہیں وہ شہید کہلاتے ہیں یعنی شہادت کا جام پینے والے ابدی زندگی سے سرفراز کر دیئے جاتے ہیں تو وہ مردانِ باخدا جو اپنی ساری زندگیاں نفس کے خلاف جہاد یعنی جہادِ اکبر میں صرف کر دیتے ہیں کیا انہیں حیاتِ ابدی کے مقام پر فائز نہیں کیا جاتا ہوگا؟ ضرور کیا جاتا ہے اور انہیں کہیں بہتر واعلیٰ مقام عطا کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردے کی یہ پہچان بیان کی جاتی ہے کہ کچھ عرصہ بعد لوگ اسے بھول جاتے ہیں اوراس کی یاد دیر تک لوگوں کے دلوں میں نہیں رہتی۔ لیکن مردانِ حق جنہوں نے اپنی زندگیاں اللہ اوراس کے دین کے لئے وقف کر دیں وہ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی یاد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

64 خوفِ الٰہی اور اہل اللہ کے معمولات (۱)

آج کے دور میں جب ایمان کی حالت انتہائی دگرگوں ہے سب سے زیادہ افسوسناک بات خوفِ الٰہی کا نہ ہونا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ لوگ الا ماشاء اللہ خوف الٰہی کے تصور سے بھی بیگانہ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اللہ والوں کے حالات کا مطالعہ کریں جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں درج ہیں۔ ان اہل اللہ کی عبادت وطاعت کی کیفیت دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل پر عجیب رقت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

آقائے دو جہاں ﷺ جنہیں اللہ رب العزت نے ہر گناہ سے معصوم پیدا فرمایا، ان کی حیات طیبہ میں خوف وخشیت الٰہی کا وہ عالم تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نماز کا وقت قریب آتا تو آپ ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ خوفِ الٰہی سے متغیر ہو جاتا اور نماز شروع کرنیکے بعد آپ کی کیفیت یہ ہو جاتی کہ گویا دنیا و مافیہا سے کوئی تعلق ہی نہیں اور سب کچھ بھول گئے ہیں۔

حضور ﷺ رات کو اٹھتے تو اللہ کی یاد میں اس قدر روتے کہ ہچکی بندھ جاتی۔ صحیح بخاری میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ ایک دن میں حضور ﷺ کی زیارت کے لئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو آقا ﷺ نماز میں مصروف تھے اور آپ ﷺ کی آہ وزاری کا وہ عالم تھا کہ سینہ مبارک سے ایسی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے ہنڈیا کی ابلنے کے وقت آواز آتی ہے۔ (جواہر البحار، ۱:۳۴)

(الشفاء، ۱:۸۵)

حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ کا یہی رنگ صحابہ کرام ﷺ کی زندگیوں پر بھی نمایاں تھا۔صحبتِ مصطفوی ﷺ نے ان کے اندر وہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ جسے بھی دیکھو خوفِ الٰہی کا پیکر نظر آتا۔

خوفِ الٰہی کا یہی عالم حضرات انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں میں نظر آتا تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ابھی بالکل معصوم بچے ہی تھے کہ جنگلوں، بیابانوں اور غاروں میں نکل جاتے اور یادالٰہی میں اتنا روتے کہ دیکھنے والے پر بھی رقت طاری ہو جاتی۔ایک دفعہ ایک پہاڑ کے دامن میں مصروفِ عبادت تھے اور اللہ کے خوف میں رو رو کر حال سے بے حال ہو گئے تھے۔سجدے میں گرے ہوئے تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ پریشانی کی حالت میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ادھر آ نکلیں، والدہ کے قدموں کی چاپ سن کر سجدے سے سر اٹھایا لیکن موت کا خیال اس قدر دھیان میں غالب تھا کہ سمجھے شاید موت کا فرشتہ ان کی روح قبض کرنے آ گیا ہے۔اسی بے خودی کی حالت میں پکارنے لگے: ''ملک الموت! ذرا ٹھہر جا مجھے اتنی مہلت دے کہ اپنی ماں کو مل آؤں۔اتنی رات گئی وہ بے چاری میری وجہ سے پریشان ہو گی اور اسے میری فکر ہو گی، مجھے تھوڑا سا وقت دے کہ ان سے آخری سلام اور دعائیں لے لوں''۔یہ سن کر آپ کی والدہ بولیں کہ بیٹا یہاں اور تو کوئی نہیں، میں تمہاری ماں تمہیں تلاش کرتے کرتے یہاں آئی ہوں۔

ماں کی ممتا سے نہ رہا گیا تو پوچھ بیٹھیں: ''تم ابھی معصوم بچے ہی تو ہو مگر، اس قدر کیوں روتے ہو؟ اس عمر میں خوف خدا سے رونے دھونے کی کیا وجہ ہے؟'' اس پر حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنی ماں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: ''امی جان اگر کل قیامت کو اللہ تعالیٰ مجھے عذاب کا مستحق قرار دے کر جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ صادر فرما دیں تو کیا آپ مجھے بچا لیں گی؟'' ان کی والدہ نے کہا ''نہیں بیٹے میں تو نہیں بچا سکوں گی''......اس پر وہ فرمانے لگے: ''امی جان اگر آپ میں اس دن مجھے عذاب جہنم سے بچانے کی طاقت نہیں تو پھر مجھے خوفِ

الٰہی میں رونے سے کیوں روکتی ہیں؟

اسی طرح کی کیفیات ہمیں صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعین، صلحاء، اولیاء اور دیگر بزرگان دین کی زندگیوں میں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کے واقعات کو پڑھ کر ہماری حالت غیر ہو جاتی ہے اور اپنی حالت دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ وہ کس قدر عظیم ہستیاں تھیں جن کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کی یاد اور ذکر میں بسر ہوتا تھا پھر بھی وہ لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو سب سے بڑا گنہگار اور مجرم کہتے۔ ان کی حالت میاں محمد بخشؒ کے بقول یہ تھی۔

راتیں ساری کر کر زاری نیند اکھیں دی دھوندے
فجریں او گنہار کہاندے سب توں نیویں ہوندے

ایک ہم کتنے بد بخت ہیں کہ اللہ کی یاد کے قریب نہیں پھٹکتے اور ہمارے دلِ خوفِ الٰہی سے آشنا نہیں اور ہماری آنکھیں گریہ وزاری سے کبھی نم نہیں ہوتیں۔ افسوس صد افسوس ہم غافل لوگ سراسر ظلم و معصیت کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ایسی دنیا میں سرگرداں ہیں جو سرکشی و بغاوت کی دنیا ہے۔

اہل اللہ کے احوال خوف اور امید کی درمیانی حالت سے عبارت ہوتے ہیں۔ جب انہیں اللہ کی رحمتوں اور کرم نوازیوں کا خیال آتا ہے تو انہیں امید لگ جاتی ہے کہ اللہ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ ہمیں بھی بخشش کا مستحق قرار دے دے، لیکن جب اللہ کے عدل کا خیال آتا ہے تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ اس تصور کو ہمارے صوفی شاعر نے بہت اچھی طرح اپنے ایک شعر میں واضح کیا ہے۔

عدل کریں تے تھر تھر کنبن اچیاں شاناں والے
فضل کریں تے بخشے جاون میں جئے منہ کالے

65 خوفِ الٰہی اور اہل اللہ کے معمولات (۲)

صالح اور متقی لوگوں کا یہ حال ہے کہ ان پر اللہ کے احسان اور انعامات جتنے زیادہ ہوتے ہیں وہ اتنے ہی خداوند کریم کے خوف کی وجہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم یہاں چند اقوال عارفِ ربانی حضرت شیخ عبدالوہاب الشعرانیؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔

''حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کے انعام واکرام سے ہر وقت کانپتے رہتے اور جتنا ان پر زیادہ کرم ہوتا اتنا ہی اللہ سے زیادہ ڈرتے''

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ''عام لوگوں کا اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اتنا ہی کافی ہے کہ جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے بچے رہیں۔ ان میں سے ہر کوئی آرزو کرتا ہے کہ کاش میں ان لوگوں میں سے ہی ہوتا'' حضرت ثوریؒ کے احوال میں یہ بھی آتا ہے کہ ان پر خوفِ الٰہی کا اس قدر غلبہ ہوگیا کہ پیشاب کے ساتھ خون آنے لگا۔ ایک یہودی طبیب کو لایا گیا تو اس نے یہ کہہ کر علاج سے معذرت کر لی کہ ان کا مرض لاعلاج ہے اس لئے کہ ان کا جگر خوفِ خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول ہے کہ ''اللہ تعالیٰ بعض اوقات مخلوق کو غفلت دے کر ان پر بہت بڑا احسان فرماتا ہے اگر ان کے حال پر غفلت کا پردہ نہ پڑا ہوتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے مر جاتے۔''

حضرت ابو سلیمان درانیؒ فرماتے ہیں کہ ’’جب خوف پر امید غالب آ جاتی ہے تو دل بگڑنے لگتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا ہی ہم جیسے لوگوں کیلئے بہتر ہے۔‘‘

انہی کا فرمان ہے کہ مجھے خوف ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے مجھے ہی منہ کے بل آگ کی طرف گھسیٹا جائے گا۔

اسی طرح ایک اور بزرگ حضرت شبعیؒ فرماتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ سے ڈرو! تاکہ امن حاصل ہو کیونکہ یہ تیرے نزدیک اس امن سے بہتر ہے جس کے بعد خوف ہو۔‘‘

امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں ’’اگر مجھے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے اور یہ اختیار دیا جائے کہ چاہوں تو جل کر خاک ہو جاؤں یا چاہوں تو صبر کروں تو میں جل کر خاک ہونے کو ترجیح دوں گا۔

حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ سے بعض روایتوں میں یہ قول منسوب ہے کہ اگر قیامت کے دن یہ اعلان کیا جائے کہ ایک کے علاوہ سب کی بخشش ہوگئی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ بخشش سے محروم شخص میں ہی ہوسکتا ہوں اور اگر منادی یہ اعلان کرے کہ صرف ایک شخص کی بخشش ہوئی ہے تو اللہ کی رحمت اور فضل کی امید رکھتے ہوئے یہ یقین کرلوں گا کہ وہ خوش قسمت میں ہی ہوں۔

اٹھ فریدا ستیا! جھاڑو دے مسیت
تو ستا رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا حال بھی بابا فرید گنج شکرؒ جیسا ہی تھا۔آپ حالت وجد و مستی میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

ترجمہ: جب رات ہوتی ہے تو عابد لوگ اس کی سختی اٹھاتے ہیں اور جب صبح آتی ہے تو وہ رکوع کی حالت میں ہوتے ہیں۔خوف الٰہی نے ان کی نیندوں کو اڑا دیا ہے لہٰذا وہ حالت

قیام میں ہوتے ہیں جب کہ بے وقوف دنیادار لوگ آرام کی نیند سو رہے ہوتے ہیں۔

آپ فرمایا کرتے تھے: ''جس دل میں غم نہ ہو وہ اس طرح خراب ہو جاتا ہے جس طرح وہ گھر جس میں کوئی رہنے والا نہ ہو اور وہ ویران ہو جائے۔''

حضرت حسن بصریؒ کی یہ حالت تھی کہ جو کوئی انہیں شدتِ غم کے عالم میں دیکھتا تو وہ یہ گمان کرتا کہ ان پر ابھی کوئی مصیبت نازل ہوئی ہے۔ یہی حالت ان کے ساتھیوں کی ہوتی تھی۔

66 اخلاقِ حسنہ اور عالمی معاشرہ

اسلام کی تعلیمات کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے کے لئے نہیں بلکہ ابد سے لیکر ازل تک کے لئے ہیں اور زمان و مکاں کی حد بندیوں کی پابند نہیں۔ اسلام بنیادی طور پر ایسے انسانی معاشروں کے قیام پر زور دیتا ہے جو اخلاقی اقدار کے حسن سے مالا مال ہوں اور جہاں تمام افراد نہ صرف علم و حکمت اور دانائی کے زیور سے آراستہ ہوں بلکہ محبت اور اخوت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہوں۔ ایسے معاشرے کا نصب العین عالمی پیمانے پر امن و خوشحالی کو یقینی بنانا ہے۔ قرآن نے اس ضمن میں تمام اہلِ کتاب کو دعوت دی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

(آل عمران، ۳:۶۴)

آپ فرما دیں اے اہلِ کتاب تم اس بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے (وہ یہ) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہیں بنائے گا پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو کہ گواہ ہو جاؤ کہ ہم تو اللہ کے

تابعِ فرمان (مسلمان) ہیں۔

اس قرآنی ارشاد میں بنی نوعِ انسان کو مشترکہ اقدار کی بنیاد پر ایک وسیع عالمی انسانی معاشرے کے قیام کی دعوت دی گئی ہے، جس کی قدر مشترک یہ ہوگی کہ اللہ رب العزت کو معبودِ حقیقی مانا جائے گا، اسی کی عبادت کی جائے گی اور کسی کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے گا۔ بلاشبہ اسلام پُر امن معاشروں کا قیام چاہتا ہے اور وہ انسان کے بنیادی حقوق کا نگہبان ہے، وہ بلاوجہ تلوار اٹھانے سے روکتا ہے۔ البتہ ظلم، فتنہ اور شر کو بزورِ شمشیر ختم کر کے امن قائم کرنے کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ امن کے بغیر کبھی عدل قائم نہیں ہوسکتا۔

اسلام میں اخلاقیات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے پرائے سب انسانوں کو اپنے دامنِ رحمت میں لئے ہوئے ہے۔ اس نے امنِ عالم کا جو تصور پیش کیا ہے تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی۔

اخلاق اور مسرت وشادمانی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ کوئی نیک کام کرے تو اس کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے، کسی کے ساتھ بھلائی کر کے آپ نہ صرف اپنے اندر اعتماد محسوس کریں گے بلکہ آپ کے پورے وجود میں کیف وسرور کی ایک لہر دوڑنے لگے گی، اسی لئے تمام اخلاقی کام نیکی کے کام ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جرم کے کام جیسے چوری، قتل، اغوا، زنا وغیرہ انسانی خوشی کے قاتل ہیں۔ وہ معاشروں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں، ان کی وجہ سے گھر اجڑ جاتے ہیں، بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں اور ماؤں، بہنوں، بیٹیوں ں کا دامنِ عصمت تارتار ہو جاتا ہے۔ اس لئے مہذب اور فلاحی معاشروں کا قیام روحانی اور اخلاقی اقدار کو فروغ دیئے بغیر عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔ لہٰذا جب ہم اخلاقی اقدار زندہ کرنے کی بات کرتے ہیں تو اپنی زندگیوں میں روحانی اقدار کو ایک تحریک بنا دینے کی بات کر رہے

ہوتے ہیں۔

اسلام میں اخلاق اور تصورِ آخرت آپس میں جڑے ہوئے ہیں، معاشرے کو اعتدال اور توازن سے ہمکنار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آخرت میں جوابدہی کا احساس ہر لمحہ انسان کے ذہن میں رہے اور یہ احساس اس کے شعور کا حصہ بن جائے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سزا اور جزا سے معاشرے کو سماجی برائیوں سے پاک کیا جاسکتا ہے۔ یہ ضروری امر ہے کہ اپنی اصلاح کا احساس انسان کے اندر سے اٹھنا چاہئے اور معاشرے کو بگاڑ اور زوال سے اسی وقت نجات دلائی جاسکتی ہے جب افرادِ معاشرہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس بگاڑ اور زوال کو ختم کرنا چاہتے ہوں۔ اس ارشادِ خداوندی میں اسی نکتے کی تعلیم دی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ	بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔ (الرعد، ۱۳:۱۱)

بداخلاقی بہت بڑی لعنت ہے جو انسان کو جہنم کا ایندھن بنا دیتی ہے۔ مصلحینِ اخلاق کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ انسان کی، حیوانی خواہشات کو ایک حد سے بڑھنے سے روکیں اور انسان کی فلاح و بہبود کے تصور کو عملی جامہ پہنائیں تا کہ معاشرے کا ہر فرد آسودگی کی زندگی بسر کر سکے۔ اگر ہر انسان خود غرضی کے حصار میں بند ہو کر اپنے مفادات کا قیدی ہو جائے تو سارا معاشرہ شکست وریخت کا شکار ہو جائے گا۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جا بجا اسلامی معاشرے کے افراد میں خوفِ خدا کا وصف پیدا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ○

(التحریم،٦٦:٦)

اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اس (نارِ جہنم) پر بڑے سخت مزاج اور زبردست فرشتے (متعین) ہیں جو اللہ کے حکم کی (کسی صورت بھی) نافرمانی نہیں کرتے اور (نہ احکام کی بجا آوری میں کسی قسم کا تساہل کرتے ہیں بلکہ) جو بھی حکم دیا جائے اسے (فوراً) بجالاتے ہیں۔

67 اسلامی معاشرے میں تصوف کی ضرورت واہمیت (۱)

یہ سوال اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے قیام، بقا اور نشو ونما پانے کے عمل میں تصوف کی کیا ضرورت واہمیت ہے؟ اس کا جواب تفصیل کا تقاضا کرتا ہے جس کے ہم یہاں متحمل نہیں ہوسکتے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ تصوف کی دو حیثیتیں ہیں: ایک تزکیۂ نفس اور دوسری مذہبی واردات سے عبارت ہے۔ ان دونوں حیثیتوں میں تزکیۂ نفس کا جائزہ لیں تو یہ بات طے شدہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اس اعتبار سے تصوف کا محتاج ہے کہ ایک صالح معاشرہ تبھی پیدا ہوتا ہے جب انسانی شعور کو ان تمام میلانات سے پاک وصاف کر دیا جائے جو اجتماعی سطح پر بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسانی نفس کا تزکیہ نہیں ہوگا معاشرتی برائیوں اور خرابیوں کا سد باب نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ — بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے (یوسف،۱۲:۵۳)

اور اس سے نجات کے لئے قرآن حکیم نے یہ لائحہ عمل بھی تجویز فرمایا:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا○ — یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اپنے اس (نفس یعنی روح) کو پاک کرلیا (سنوار لیا) (الشّمس،۹۱:۹)

چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ اپنے کردار وسیرت کو پاکیزہ کرنے کے لئے انسانوں کو

نفس کا تزکیۂ درکار ہے جس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ فہم ہے کہ انسان کے لاشعور میں ہمیشہ نیکی اور بھلائی کا عنصر غالب رہتا ہے جب کہ اس کے شعور کی سطح پر برائی اور شر کی قوتیں حملہ آور رہتی ہیں۔ اس طرح ایک تضاد کی کیفیت برقرار رہتی ہے اور یہ کیفیت اس وقت تک رہتی ہے جب تک ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو اپنے تابع نہ کر لے۔ شعور اور لاشعور کے تقاضے متضاد ہیں۔ انہیں ہم آہنگ اور سازگار بنانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ لاشعور کو شعور کے تابع کر کے نیکی کو مغلوب اور بدی کو غالب کر لیا جائے، اس طرح سے روحانی اور اخلاقی جدوجہد کرنے والی قوتیں پسپا ہو جائیں گی اور بالآخر اسلامی معاشرے کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ دوسری صورت شعور کو لاشعور سے مغلوب کرنے کی ہے جس سے بدی کے تقاضے نیکی کے تقاضوں کے تابع ہو جائیں گے مگر یہ صورت تبھی ممکن ہے جب نفسِ انسانی تزکیہ کے عمل کے ذریعے اپنی تمام آلائشوں سے پاک وصاف ہو جائے، اور نفسِ امارہ انسان کو برائیوں اور بداعمالیوں پر اکسانے سے باز آ جائے۔

پس انسانی شخصیت کی نشوونما کا انحصار اخلاق اور مذہب کی ترقی پر ہے جس سے روحانی الذہن افراد پیدا ہوتے ہیں اور یہی حقیقت میں تصوف کا منشا و مقصود ہے جو اسی صورت میں ممکن ہے کہ نفسِ انسانی کی ان کثافتوں کو دور کیا جا سکے جن کی وجہ سے نیکی نشوونما نہیں پا سکتی، کیونکہ ان کی موجودگی میں نفس کی زیادہ تر قوت فواحش و مکروہات کی پرورش پر صرف ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ کوئی شخص ایک کیاری میں محنت سے زمین تیار کر کے پودینہ اگانا چاہتا ہو تو کچھ عرصہ بعد پودینے کے ساتھ گھاس اور دوسری خودرو بوٹیاں اگ آئیں گی جو پودینے کی صحیح نشوونما میں حائل ہوں گی۔ اگر اس گھاس پھونس اور جڑی بوٹیوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اس سے پودینے کی نشوونما پر اچھا اثر پڑے گا کیونکہ وہ غذا

جو پودینے کے لئے ضروری تھی اور غیر ضروری گھانس پھونس پر ضائع ہو رہی تھی اب وہ ساری کی ساری پودینے کو پروان چڑھانے میں صرف ہونے لگے گی۔ یہ گھاس پھونس اکھاڑنے کا عمل دراصل کیاری کا تزکیہ ہے۔

اس طرح نفس کا تزکیہ کرنے سے وہ قوتیں جو نیکی کی استعداد کو بڑھاتی اور روحانیت کی نشو ونما پر صرف ہوتی ہیں جب غالب آ جاتی ہیں تو انسانی سیرت و کردار پر اس کا خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ اس عمل کو جاری رکھنے سے رفتہ رفتہ نفسِ امارہ نفسِ لوامہ میں بدلتا ہے اور پھر ترقی کے مدارج طے کر کے نفس مطمئنہ اور بالآخر نفسِ راضیہ اور نفسِ مرضیہ کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ تزکیۂ نفس کی ضرورت و اہمیت مزید کسی بیان کی محتاج نہیں۔ جب ایک فرد نفس کے تزکیے کا محتاج ہے تو پھر اجتماعی سطح پر پورے معاشرے کو اس کی ضرورت سے کیونکر بے نیاز قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ معاشرہ ہے ہی منظّم افراد کے اجتماع کا نام۔ اس لئے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرے کا قیام اجتماعی طور پر افراد سے تزکیۂ نفس کا تقاضا کرتا ہے تاکہ اس میں ایسے افراد پیدا ہوں جو روحانی الذہن ہوں اور اخلاقی جدوجہد کو جاری رکھ سکیں۔ جب تک ایسے افراد وجود میں نہیں آئیں گے اس معاشرے کو اسلامی معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔

اب چونکہ تصوف تزکیۂ نفس کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلامی معاشرہ اپنے وجود ارتقا اور ترقی کے لئے تصوف کا محتاج ہے۔

68 اسلامی معاشرے میں تصوف کی ضرورت واہمیت (۲)

تصوف کی دوسری حیثیت مذہبی واردات کی ہے جو ایمانی حقائق کے نتائج کے مشاہدے کا ذریعہ بنتے ہیں اور ان سے ایمان کو ''ایقان'' کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقیؒ انسانی شخصیت میں نظم وضبط لانے کے لئے ضروری ہے کہ اعتقاد، علم اور عمل باہم سازگار رہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو عمل اعتقاد کا ساتھ نہیں دیتا اور شخصیت کا توازن بگڑنے لگتا ہے۔

بحیثیت مسلمان ہمارا مابعد الطبیعی حقائق پر ایمان ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے اعتقاد کی عمارت میں لرزہ ہے اور ہم تذبذب کے سمندر میں غوطہ زن رہتے ہیں۔ بالخصوص ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ذہنی اور قلبی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کا علاج اس طبقے کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے یا اس پر کفر والحاد کا فتویٰ صادر کر دینے سے نہیں ہوگا اور نہ ہی اس طرح ہماری مذہبی قیادت اپنے فرائض سے سبکدوش ہو سکتی ہے۔

مذہبی واردات کو تصوف کا حوالہ بناتے ہوئے ہم انہیں تین خانوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ وہ واقعات جو خرقِ عادات کے نام سے جانے جاتے ہیں یعنی جن کے واقع ہونے کی وجہ عام انسان کی سمجھ میں نہ آئے مثلاً دور کی مسافت پر ہونے والے مستقبل میں ہونے والے واقعات کا بلا واسطہ اور قبل از وقت علم، دل کی باتوں کا کشف، بغیر دوا کے مریض کی فوری شفایابی، مردے کو زندہ کرنا۔ یہ سب باتیں خوارق ہیں جو وہبی بھی ہو سکتی

ہیں اور کسبی بھی تو، تصوف کی زبان میں انہیں ''کرامت'' کہا جاتا ہے۔

۲۔ جو اعمال شریعت کی پابندی میں امر و نہی کو واجب العمل سمجھ کر کیئے جائیں وہ اخلاقی فضائل ہیں اور جو شریعت کی خلاف ورزی میں صادر ہوں انہیں اخلاقی برائیاں کہا جاتا ہے کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے کسی ارادی فعل کی نیت کا معیار ''حکم'' ہے حکم کا اتباع ''حسنِ نیت'' جبکہ حکم کی خلاف ورزی ''سوءِ نیت'' ہوتی ہے۔ اخلاقی فضائل تبھی حاصل ہوسکتے ہیں جب ان میلانات پر قابو پالیا جائے جو تزکیۂ نفس میں انحراف اور رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ تاہم تزکیہ کے بعد حاصل ہونے والے اخلاقی فضائل ارادی اور اختیاری ہونے کی وجہ سے فضائلِ اخلاق ہیں۔

۳۔ تصوف یا مذہبی واردات کا نقطۂ کمال مقامِ ولایت ہے۔ یوں تو ولایت اور نبوت دونوں مذہبی وارادات ہی کی شکلیں ہیں مگر ان دونوں کمالات کے درمیان بنیادی فرق ہوتا ہے۔ نبوت فضلِ محض اور خالص وہبی چیز ہے جبکہ ولایت میں کسب یعنی ولی کی ذاتی محنت کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ نبوت کا خاصہ ''صحو'' ہے جبکہ ولایت میں ''سکر'' بھی شامل ہے۔ نبوت کے تمام معارف حتمی و قطعی اور یقینی ہیں جبکہ ولایت میں بعض ظنی بھی ہوسکتے ہیں۔ نبوت کے تمام حقائق کی نوعیت نفس الامری کی ہے جبکہ ولایت کے حقائق کی حیثیت باطنی کیفیات کی ہے اور سب سے اہم نبوت کا منصب تبلیغ کے لئے ہے لہٰذا یہ ''قال'' ہے جبکہ ولایت کے معارف ''حال'' ہیں اور وہ ابلاغ و اظہار سے بے نیاز ہیں۔ صاحبِ نبوت کی توجہ ہر وقت لوگوں کے اصلاحِ حال کی طرف ہی لگی رہتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا مذہبی واردات کی ماہیت بندے اور خدا کے درمیان نسبت کے استحکام میں پوشیدہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نسبت کا شعور مذہبی واردات یعنی تصوف کہلاتا ہے۔ یہ شعور پوری انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس سے عملی زندگی

ایک خاص انداز سے متاثر ہونے لگتی ہے۔ چونکہ افراد کی شخصیت اپنے نمونے کے اعتبار سے مختلف سانچے میں ڈھلتی ہے اور اس اختلاف کی وجہ شعور کے تین پہلو: جذبہ، ارادہ اور ادراک ہیں۔ کسی کے شعور میں جذبے کا پہلو غالب ہو تو اس کے اور خدا کے درمیان ''نسبتِ محبت'' پختہ تر ہو جاتی ہے۔ محبت میں طالب اور مطلوب کے ایک ہو جانے کی آرزو کمالِ قرب پیدا کرتی ہے اور اس نسبت سے محبوب کی ذات میں یک گونہ استغراق و انہماک یعنی مکمل توجہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے من و تو کے تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس نسبتِ محبت کو تصوف کی زبان میں ''ولایتِ عیسوی'' کہتے ہیں۔ اگر سالک کے شعور میں ارادے کا پہلو غالب ہو اور اس کے اور خدا کے درمیان نسبتِ اطاعت پختہ تر ہو جائے تو اسے ''ولایتِ موسوی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر اس کے شعور میں ادراک کا پہلو غالب ہو جائے تو اس نسبتِ معرفت کو ''ولایتِ ابراہیمی'' کہا جاتا ہے۔

69 تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم

''تزکیہ'' کے معنی پاک صاف کرنے اور نشوونما دینے کے ہیں۔اسی سے زکوٰۃ کا لفظ نکلا ہے۔اسی طرح کھیتی کے نشوونما پانے اور اس سے خیر و برکت حاصل ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہر جگہ یہ لفظ ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱.مَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِهٖ (فاطر:۱۸)

اور جو کوئی پاک ہوا پس وہ اپنی ہی جان کے لئے پاک ہوتا ہے۔

۲.ذٰلِكَ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ،۲۳۲)

یہ تمہارے لئے زیادہ پاک اور صاف ہے۔اللہ بہتر جانتا ہے اور تم (حقیقتِ امر کو) نہیں جانتے۔

۳. قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا (مریم:۱۹)

اس نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں۔تجھ کو ایک پاک لڑکا دینے کے لئے آیا ہوں۔

٤.فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم:۳۲)

تم اپنی جانوں کو پاک صاف مت بتاؤ! وہ (اللہ) بہتر جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے۔

۵. يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

(البقرہ:۱۵۱)

وہ رسول ﷺ تمہارے اوپر ہماری آیات پڑھتے ہیں اور تمہارے نفوس کو پاک کرتے ہیں اور تمہیں کتابِ الٰہی کی تعلیم دیتے ہیں اور حکمت و دانائی (یا اسرار و رموزِ دیں) کی تعلیم دیتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ تم نہیں جانتے اس کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ ''تزکیہ'' کا عمل جانوں کو آلائشوں اور گندگیوں سے پاک وصاف کرنے کا نام ہے، اب صاف ظاہر ہے کہ پاک صاف کرنے کی ضرورت تبھی ہوتی ہے جب انسانی نفس کے اندر میل کچیل ہو اور میل کچیل کا موجود ہونا اس وجہ سے ممکن ہے کہ انسانی فطرت کے اندر نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات اور صلاحتیں رکھ دی گئی ہیں۔

تزکیۂ نفس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ نفس انسانی گویا روح کی کھیتی ہے جس میں آپ نیکی، بھلائی اور اچھے اخلاق کے بیج اگانا چاہتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ نفسِ انسانی کی اس زمین میں برائی اور برے اخلاق کے پودے بھی خود بخود اگ آتے ہیں جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ نفس انسانی میں دونوں طرح کے رجحانات ہوتے ہیں اور نفس انسانی کی قوتیں نیکی کی نشوونما کی بجائے برائی کی نشوونما پر صرف ہونے لگتی ہیں۔ لہٰذا نیکی اور تقویٰ کی صحیح نشوونما کے لئے گناہ اور معصیت کے رجحانات سے نفس انسانی کی زمین کو پاک کر دینا تزکیۂ نفس کہلاتا ہے۔ اس تزکیے کے نتیجے میں نہ صرف نفسِ انسانی برائی سے پاک وصاف ہو جاتا ہے بلکہ اس میں نیکی کی نشوونما ہونے لگتی ہے۔ اس عمل کے بارے میں ارشادِ باری

تعالیٰ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰیO وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی

بیشک وہ فلاح پا گیا۔ جس نے نفس کو پاک صاف کرلیا۔ پھر اپنے رب کے نام کو یاد کیا اور نماز پڑھی۔

(الاعلیٰ: ۱۴، ۱۵)

اس آیت میں تین چیزوں، تزکیہ نفس، ذکرِ الٰہی اور نماز کا بیان ہے۔ یہ گویا تین شرائط ہیں جن کو اگر پورا کر دیا جائے تو انسان فلاح پا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نفسِ انسانی کو تزکیہ نفس کی تحریک کس طرح ہوتی ہے؟ اس کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انسان کی فطرت کے اندر ایک تضاد کی سی کیفیت رکھ دی گئی ہے جس سے تزکیۂ نفس کی آرزو جنم لیتی ہے۔ ہر انسان میں پیدائشی طور پر فطری احساسات پائے جاتے ہیں۔ ان احساسات کے شعور کو ''ضمیر'' کا نام دیا جاتا ہے جبکہ اس کے ساتھ نفسانی خواہشات کا داعیہ بھی موجود ہے جس کا ظہور ہر انسان کی زندگی میں فعلاً ہوتا ہے۔

ہر شخص کی خلقی فطرت میں اچھائی برائی اور خیر و شر کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس امر کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا

پس اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے اندر برائی اور اچھائی دونوں کا شعور ودیعت کر دیا ہے۔

(الشّمس، ۸)

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا ہے۔

فَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ

پس ہم نے انسان کو نیکی اور بدی کے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

(البلد: ۱۰)

70 مومن کون ہے؟

مومن کی تعریف میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مومن وہ ہے جس میں صفتِ ایمان پائی جائے۔ مگر یہ مختصر تعریف ہے۔ اس بنا پر یہاں قدرے تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم میں مومن کی تعریف میں ایک جامع ترین آیت نازل ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ O (الحجرات، ۱۵:۴۹)	مومن تو وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے اور خدا کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کیا۔ یہی لوگ ایمان کے سچے ہیں۔

اس آیت کی رو سے مومن فقط وہی ہیں جن میں اوپر بیان کردہ اوصاف اور خصوصیات پائی جائیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ آیتِ کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کو دوسری صفات سے پہلے رکھا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کو خدا اور اس کے رسول ﷺ پر صحیح معنوں میں اعتماد اور یقین پیدا ہو جائے تو اس کے لئے دین کی جملہ باتوں کا قبول کرنا سہل ہو جاتا ہے۔

ایمان کے معنی تصدیق قلبی کے ہیں۔ اگر دل میں شک اور تردد ہو تو محض زبان سے تصدیق کرنے کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں۔ اسی بنا پر

مومن کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ مومن وہ ہے جس کے دل میں خدا اور اس کے رسول ﷺ سے متعلق کوئی ادنی درجے کا وہم بھی موجود نہ رہے۔ ایمان ایک ایسی باطنی اور اعتقادی کیفیت کا نام ہے جہاں پہنچ کر ہر قسم کا تردد، شک، تامل اور تذبذب دور ہو جاتا ہے۔اور انسان کو اس درجہ پختہ یقین (صوفیانہ اصطلاح میں حق الیقین) حاصل ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اور مخالفین کی کوئی دلیل اسے متزلزل نہیں کر سکتی۔لہٰذا اس کے یقین میں لچک پیدا ہونے، اس کے رویئے میں بے رہروی اور اسکے قدموں کے بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اعتقادِ قلبی اور یقین کی باطنی کیفیت کا نام ایمان ہے اور یہ کیفیت آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے۔شروع شروع میں یہ کیفیت کمزور بھی ہو تو انسان کو مختلف ذرائع سے علم حاصل کر کے اسے پختہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً۔	مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

(البقرہ،۲:۲۰۸)

ایمان میں پختگی اور یقین میں قوت پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ وہ اشیاء جو اس کے ایمان و یقین میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں ان کو راہِ خدا میں ترک کر دیا جائے۔ارشاد نبوی ہے:

حُبُّ الدُّنۡيَا رَاسُ كُلِّ خَطِيۡئَةٍ	دنیا کی محبت ہر برائی کی بنیاد ہے۔

(مشکوۃ المصابیح،۴۴۴)

اور اس کے برعکس:

راس الحکمة مخافة اللہ — اللہ کا خوف حکمت کی بنیاد ہے۔

(کنز العمال: ۵۸۷۳)

مومن خود دوسروں کے حق میں امن و سلامتی کا پیکر اور ذریعہ ہوتا ہے لیکن یہ ایمان کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس سے بڑا درجہ یہ ہے کہ وہ معاشرے میں موجود برائیوں، شر اور فساد کو ختم کرنے کے لئے میدان عمل میں نکل آتا ہے اور اس وقت تک اپنی کوشش جاری رکھتا ہے جب تک برائی شر اور فساد کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ — اور ان سے مسلسل لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

(الانفال، ۸: ۳۹)

فتنہ و فساد کو مٹانا مومن کی ذمہ داری ہے۔ جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو جائے، اس کے لئے کوشش جاری رکھنے کا حکم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مومن کی اس ذمہ داری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

من رای منکم منکراً فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه و ذالك اضعف الایمان۔ — جو شخص تم میں سے کوئی برائی دیکھے وہ اسے ہاتھ سے درست کردے۔ اگر اسے اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اسے برا کہے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

(صحیح المسلم، ۱: ۵۱، کتاب والایمان، رقم حدیث: ۴۹)

بنیادی طور پر مومن اخوت اور بھائی چارے کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے "انما المومنون اخوة "(مومن تو بس بھائی بھائی

ہیں)۔ چنانچہ مومن کے دل و دماغ میں دوسروں کے لئے بھلائی، امن اور خیر خواہی کے جذبات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر حضور ﷺ نے فرمایا:

الدین النصیحة دین خیر خواہی کا نام ہے۔

(جامع الترمذی، ۱:۱۴، کتاب البر والصلہ :۱۹۲۶)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن کامل وہ ہے جس کا وجود انسانیت کے لئے سراسر نفع اور آسودگی کا باعث بن جائے۔

71 سورۃ فاتحہ اور حیاتِ انسانی کا عملی پہلو

سورۃ فاتحہ انسانی عقیدے کی اصلاح کی غرض سے زندگی کے عملی پہلو کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتی ہے اس کی چوتھی آیت ہے

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ (الفاتحہ، ۱:۴)

یہ آیہ کریمہ سب کچھ اسی ذات کو قرار دیتی ہے جو اللہ، رب، رحمان اور رحیم ہے۔ اس لئے اس کے سوا نہ کسی کی عبادت کا سوال پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ہی کسی سے استعانت کا۔ یہ اعلان انسانی عمل کی نوعیت اور سمت کو متعین کرنے کے لئے کیا گیا۔ یہاں دو لفظ ''عبادت'' اور ''استعانت'' استعمال کئے گئے۔ عبادت سے مراد انتہائی عاجزی، انکساری اور خاکساری کا اظہار ہے۔ اس کے مقابلے میں صاف ظاہر ہے، اس ذات وحدہٗ لاشریک، کی عظمت و کبریائی ہی ہوسکتی ہے۔ اس وجہ سے عبادت کا ایک ہم معنی لفظ بندگی اور غلامی بھی ہے۔ گویا عبادت سے مراد یہ ہوگا کہ اللہ کو عظمت و کبریائی کا مالک سمجھ کر اپنا آقا تسلیم کیا جائے اور خود کو اس کا عاجز و حقیر بندہ۔ یہاں ذہن میں کسی قسم کا مغالطہ نہیں رہنا چاہیے کہ عبادت محض نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ ہی کا نام ہے بلکہ یہ عمل پوری زندگی اور اس کے لئے کی جانے والی جدوجہد پر مشتمل ہے۔

اگر یہ تصور دل و دماغ میں پختہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا آقا و مالک ہے اور ہم اس کے عاجز بندے ہیں تو بندگی کا حق تبھی ادا ہوگا کہ زندگی میں جو کچھ بھی کیا جائے وہ اپنے

مالک کی مرضی اور خوشنودی کی خاطر کیا جائے۔اس طرح زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل عبادت قرار پائے گا۔اس میں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور آرام کرنے سے لے کر تجارت، سیاست، امارت اور صلح و جنگ کے میدانوں تک اٹھنے والا ہر ایک قدم، ہر ایک سانس اور ہر عمل عبادت بن جاتا ہے۔گویا سورۃ فاتحہ ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ جس طرح انسان اپنے آغاز سے انجام تک اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے فیض سے مستفید ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح اسے چاہیے کہ اپنی عملی زندگی کو آغاز سے انجام تک ہر لمحہ اس کی غلامی اور بندگی میں گزار دے اور یہ تصور اس کے ذہن میں پختہ ہو جائے کہ اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی بندگی کی جا سکے۔

سورۃ فاتحہ میں استعانت کا تصور انسانی زندگی کے بعض خصوصی لمحات پر جبکہ عبادت کا تصور اس کی عمومی حالت پر حاوی ہوتا ہے کیونکہ مدد کی ضرورت انسان کو عام طور پر دو طرح کے معاملات میں ہوتی ہے۔ایک کوئی ایسی مشکل آپڑے کہ انسان اپنے تمام وسائل اور ذرائع کو کام میں لاکر بھی اس سے باہر نہ نکل سکے۔دوسرا یہ کہ کوئی ایسی خواہش اور آرزو ہو جس کو وہ ذاتی کوششوں سے حاصل نہ کر سکے۔

جب انسان کسی مصیبت اور مشکل یا کسی خواہش اور طلب کی شدت کی وجہ سے پریشان ہو جائے اور اسے اپنا مقصد ذاتی کوششوں سے حاصل ہوتا نہ دکھائی دے تو اس میں بے چینی اور اضطراب کی کیفیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔جس سے اس کے زندگی کے معمولات متاثر ہونے لگتے ہیں۔یہ وہ حالت ہے جہاں انسان شدت کے ساتھ کسی مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور جس قدر یہ ضرورت شدید ہوگی اس کے اندر مدد طلب کرنے کا احساس بھی اسی قدر شدید ہوگا۔اس لمحے وہ بندہ جس نے اپنی ساری زندگی رب العالمین کی غلامی میں گزار دی ہو اور اسی کو اپنا آقا و مولا سمجھا ہو اگر وہ طلب و ضرورت کی شدت اور

جذبات کے بہاؤ میں آ کر کسی اور کے آگے جھک گیا تو اس کی ساری محبت و ریاضت اور بندگی کا اخلاص رائیگاں جائے گا اور اس کی عمر بھر کی پونجی لٹ جائے گی گویا بقول اقبالؒ

ے پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

انسان کی زندگی میں یہی وقت بندگی اور عبودیت کی آزمائش کا ہوتا ہے کہ آیا وہ مشکل اور آزمائش کی اس گھڑی میں اس کا بندہ رہا یا نہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے اسی مرحلے کو بیان کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ہو وہ کتنا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

72 سورۃ فاتحہ اور تصورِ ہدایت (ا)

جب انسان دنیوی مصروفیات سے فراغت پا کر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے تو حالتِ نماز میں ہاتھ باندھ کر ذاتِ حق کی حمد و ثنا اور اس سے نیاز مندانہ تعلق کے بیان کے بعد اس کے من کی گہرائیوں سے آواز اٹھتی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ   اے رب! ہمیں سیدھی راہ چلا

(الفاتحہ، ۱:۵)

صاف ظاہر ہے کہ منزل کا تعین کئے بغیر کوئی بھی راہ قابلِ ذکر اہمیت نہیں رکھتی۔ سب سے پہلے انسان اپنے نصب العین کے مطابق کسی منزل کو اپنا مقصود بناتا ہے تو پھر اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس کے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی مسافر کسی سے صحیح راستہ دریافت کرتا ہے تو اس کا راستہ دریافت کرنا ہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کوئی نہ کوئی منزل ضرور اس کے سامنے موجود ہے جس تک پہنچنے کا اس نے پہلے سے سوچ رکھا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ منزل اور نصب العین کے شعور کے بغیر کوئی کسی سے راستہ پوچھتا پھرے۔ سورۃ فاتحہ کی یہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ سے صحیح راستہ دکھانے کی التجا کی گئی ہے اس بات کی نشاں دہی کر رہی ہے کہ حیاتِ انسانی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ اس منزل ہی کے متلاشی التجا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہمیں وہ راہ دکھا دے، جس پر چل کر ہم وہ نصب العین پا سکیں جس کے لئے ہمیں تو نے پیدا کیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ کیا مقصد اور منزل کے تعین کے بغیر کوئی عقلِ سلیم رکھنے والا شخص سیدھی راہ کی طلب کر سکتا ہے؟ اگر

منزل کا شعور واضح نہیں تو سوال کرنے والے کا ذہن اس سوال میں الجھ جائے گا کہ کونسی سیدھی راہ؟ اور کس مقصد کے لئے؟ اور کہاں پہنچنے کی خاطر؟ اس طرح کا ہر سوال خود ایک معمہ بن جائے گا اور قرآن حکیم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کوئی ایسی غیر واضح اور نہ سمجھ میں آنے والی بات کرے جس کا اس کے پاس جواب نہ ہو۔ لہٰذا **اھدنا الصراط المستقیم** کے کلماتِ دعا زبان سے نکالنے سے پہلے انسان کے ضمیر سے یہ ندا بلند کرائی جاتی ہے کہ اے رب العالمین! ہمیں یہ بتا دے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہماری وہ منزل اور نصب العین کیا ہے جس کے لئے ہم زندہ ہیں اور جسے حاصل کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے؟ جب مقصد کا شعور بیدار ہو جاتا ہے اور جس منزل تک ہمیں پہنچنا ہے اس کے خدوخال واضح ہوکر ہمارے سامنے آجاتے ہیں تو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ پکار اٹھتی ہے کہ اے ہدایت عطا کرنے والے! ہمیں اس منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بھی دکھا دے۔
لیکن ہدایت کا مقصد ان دو تقاضوں سے پورا نہیں ہوتا جب تک اس منزل مقصود تک پہنچنے کی یقینی ضمانت نہ میسر آجائے۔ کیونکہ بہت ساری شیطانی اور طاغوتی طاقتیں انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے پر لگی ہوئی ہیں۔ شیطان کا سب سے بڑا حملہ ہی سیدھی راہ پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے بتایا کہ ابلیس نے بارگاہِ خداوندی میں قسم کھا کر کہا تھا:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ.	(مجھے قسم ہے کہ) میں (بھی) ان (افراد بنی آدم کو گمراہ کرنے) کے لئے تیری سیدھی راہ پر ضرور بیٹھوں گا۔

(الاعراف، ۷:۱۶)

اس لئے عین ممکن ہے کہ کوئی شخص منزل اور صحیح راستے کی خبر پا کر سفر پر نکلے، لیکن راستے میں ایسے حالات پیش آجائیں کہ وہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ اس وجہ سے انسان کو اکثر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے سیدھی راہ کی ہدایت کے علاوہ خیر و

عافیت کے ساتھ پہنچ جانے کی ضمانت بھی مہیا کی جائے تا کہ راستے کے شیطانی خطرات سے محفوظ ہوکر وہ اپنی منزل کو پا سکے۔ یہ انسانی ضمیر کی تیسری آواز تھی جو ''**اھدنا الصراط المستقیم**'' کے الفاظ کی شکل میں اس کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔

یہ تین تقاضے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ہدایت کے تین درجے ہیں۔ جنہیں آسان زبان میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مقصد کا شعور اور نصب العین کی معرفت (پہچان)

۲۔ صحیح راستہ دکھایا جانا تا کہ منزل تک پہنچنا ممکن ہو۔

۳۔ یہ ضمانت کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

سورۃ فاتحہ حیاتِ انسانی کے مقصد اور نصب العین کے شعور سے لے کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی حتمی ضمانت کے حصول تک راہنمائی کر رہی ہے۔ آیت کے الفاظ پر دوبارہ غور کریں تو یہ حقیقت ہم پر کھل جائے گی۔

73 سورۃ فاتحہ اور تصورِ ہدایت (۲)

گزشتہ صفحات میں بیان کردہ سورۃ فاتحہ کی اس آیت پر دوبارہ غور فرمائیں تو ہم پر یہ حقیقت کُھل جائے گی کہ جس طرح آیت کے تین حصے، ''اھدنا''، ''الصراط''، ''المستقیم' ہیں ایسے ہی حیاتِ انسانی کی راہنمائی کے تین گوشے ہیں، جنہیں قدرے تفصیل سے سمجھنا ضروری ہے۔

اھدنا:

اس پکار کے ذریعے انسان اپنے مولا سے شعوری ہدایت طلب کرتا ہے۔ وہ اپنے خالق و مالک سے ایسا شعور مانگتا ہے جس کی بدولت اسے اپنی منزل کی خبر ہو سکے۔ یہ کہہ کر وہ اپنی زبان سے یہ اقرار کر رہا ہے کہ اے شعور عطا کرنے والے! مجھے کسی روشنی، تاریکی، علم اور جہالت کا شعور نہیں، اس لئے تو میں اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں، اپنی منزل سے بے خبر ہوں اور یہ علم بھی نہیں کہ میرے پیدا کئے جانے کا کیا مقصد ہے؟ میں نہیں جانتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ مجھے وہ ہدایت اور معرفت عطا کر دے جس سے میں اپنی زندگی کے نصب العین کو جان سکوں۔ میں تجھ سے منزلِ حیات کا شعور مانگتا ہوں۔ اس کا تعین مجھے عطا کر دے تاکہ میں اپنی زندگی کے مقصد سے آگاہ ہو سکوں اور یہ کہ مجھے کیوں پیدا کیا گیا۔ جب یہ دعا صدقِ دل سے نکلتی ہے تو اس کی پکار پر ہدایتِ حق متوجہ ہوتی ہے اور انسان کو شعورِ مقصد عطا کر دیا جاتا ہے۔

الصراط: اس کے بعد ایک نئی طلب جنم لیتی ہے اور ''الصراط'' کی پکار کے ذریعے وہ

بارگاہِ خداوندی میں عرض گزار ہوتا ہے کہ مجھے راستے کے تعین کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے خالق و مالک سے ایسی راہنمائی مانگتا ہے جس کی بدولت اسے اس راستے کی خبر ہو سکے جو اسے منزل تک پہنچانے والا ہے۔ وہ اس پکار سے اس امر کا اعتراف کر رہا ہے کہ اے راستہ دکھانے والے! مجھے معلوم نہیں کہ کونسا راستہ اس منزل کو پانے کے لئے صحیح ہے اور کونسا غلط؟ تو اپنی رحمت سے مجھے سیدھی راہ کی ہدایت کر دے اور میرے لئے اس راستے کو ہموار کر دے جس پر چل کر میں اپنی منزلِ حیات کو پاسکوں۔ دل سے اٹھنے والی اس پکار پر ہدایتِ حق متوجہ ہوتی ہے اور انسان کو صحیح راستے کی نشان دہی کر دی جاتی ہے۔

المستقیم: خدا کے بندوں کو اس کی طرف جانے والے راستے میں جگہ جگہ شیطان گھات لگائے بیٹھے ہیں جو انسان کو ٹیڑھی راہوں پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں جو اس کو جہنم کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو منزل مقصود کی طرف جانے والے سیدھے راستے کی رہنمائی اور اس پر چلنے کی توفیق مانگنے کی دعا سکھائی۔ تاکہ ان کو سیدھی راہ بھی نظر آئے اور اس پر چلنے کی توفیق بھی میسر ہو۔ اے راستوں کو ہموار کرنے والے! مجھے مستقل مزاجی کی وہ دولت عطا کر دے جو مجھے یقین کے ساتھ میری منزل تک پہنچا دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صحیح راستے پر چلتے چلتے بھٹک جاؤں اور پھر مجھے منزل کا سراغ نہ مل سکے۔ اس لئے مجھے وہ راہ دکھا دے جو محفوظ ہو اور جس پر کوئی ڈاکو مسافروں کو لوٹنے کے لئے گھات لگائے نہ بیٹھا ہو، جس پر شیطان مجھے بہکا نہ سکے۔ اے شعور عطا کرنے والے! مجھے مقصدِ حیات عطا فرما! جب دل کی گہرائیوں سے یہ ندا نکلتی ہے تو ہدایتِ حق متوجہ ہو کر انسان کو حفاظت کے حصار میں لے لیتی ہے اور اسے استقامت کی نوید سناتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

میرے بندو! اگر حفاظت کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ضمانت چاہتے ہو تو

آؤ میرے انعام یافتہ بندوں کے ہم سفر بن جاؤ، ان کی معیت، سنگت اور دوستی اختیار کر لو جن پر کبھی میرا غضب ہوا ہے اور نہ وہ کبھی راہِ ہدایت سے بھٹکے ہیں۔

یہ یقینی بات ہے کہ وہ جو طالبِ ہدایت بن کر ان اللہ کے پسندیدہ بندوں کا ہمسفر بن جاتا ہے وہی اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب و کامران ہوگا اور اسے منزلِ مقصود مل کر رہے گی۔ اسے راستے میں کوئی بہکا نہ سکے گا۔ ایسے مردانِ حق کی استقامت دیکھ کر شیطان خود ان لفظوں میں اپنی عاجزی اور بے بسی کا اعتراف کرتا ہے۔

لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَO إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَO (الحجر، ۱۵:۳۹۔۴۰)

ان سب کو ضرور گمراہ کر کے رہوں گا، سوائے تیرے ان برگزیدہ بندوں کے جو (میرے اور نفس کے فریبوں سے) خلاصی پا چکے ہیں۔

74 مومن کے اوصاف

حقیقت میں مومن وہ ہے جو اپنے دل میں پوری انسانیت کا درد اور غم رکھتا ہو۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک سچے مومن کی یہ کیفیت بیان فرمائی ہے۔

المؤمن للمؤمن كالبنيان يَشُدُّ بعضه بعضا	مومن (ہر دوسرے مومن) کے لئے ایک عمارت کی طرح ہوتا ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔

(صحیح المسلم، ۲:۳۲۱، کتاب البر والصلہ، رقم حدیث: ۲۵۸۵)

حضور ﷺ کے اس ارشاد کی رو سے جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر ایک دوسرے کے لئے سہارا بنتی ہے اسی طرح اہل ایمان کا اتحاد مسلم معاشرے کی بنیاد بنتا ہے۔ جب ان میں اخوت اور بھائی چارے کے جذبات پیدا ہو جائیں اور ہر فرد اپنی بجائے دوسروں کے نفع ونقصان کو اپنے پیش نظر رکھے تو ہر شخص دوسرے کا سہارا بن جاتا ہے اور کوئی اس کے کسی بھائی پر ظلم وستم توڑنا چاہیے تو وہ اس کی مدد کو دوڑتا ہے۔ اس طرح جو معاشرہ جنم لیتا ہے وہ باہمی اتحاد، اتفاق اور تعاون و اشتراک کی وجہ سے مضبوط و مستحکم حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ

''مومن کی مثال محبت، رحمت اور عاطفت کے حوالے سے ایک جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کا کوئی حصہ تکلیف محسوس کرتا ہے تو تمام جسم رات بھر جاگنے درد سہنے اور بخار میں مبتلا رہنے میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔

یعنی جس طرح جسم کے ایک حصے میں درد پورے جسم کے لئے بے چینی کا باعث بنتا ہے بعینہ یہی مثال مومن کی ہے۔ اگر اس کے کسی مومن بھائی کو تکلیف پہنچے تو وہ سراپا اضطراب اس کے لئے دردمندی اور اس کی خیر خواہی خواہی کی علامت بن جاتا ہے۔

ایک اور ارشاد نبوی ﷺ میں مومن کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ	تم میں کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔
(صحیح البخاری، ۱:۲، کتاب الایمان، رقم حدیث:۱۳)	

ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان خود کو مقدم رکھے مگر اپنی پسندیدہ شئے میں دوسروں کو بھی شامل کرے۔ مگر ایمان کے اعلیٰ درجے میں جو شے اسے اپنے لئے پسند ہے اسے اپنے استعمال میں لانے کی بجائے دوسروں کو استعمال کے لئے دے دے اور خود کو مؤخر کر لے۔ جہاں ذات کے سارے مفادات دوسروں کی خاطر قربان ہو جائیں وہاں ایمان اپنے درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہی ہے جو انسان کو ایثار وقربانی کا درس دیتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو اسے خود بھوکا پیاسا رہنے اور دوسرں کے لئے سیری اور سیرابی کا سامان فراہم کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی لافانی جذبے کی پذیرائی آنے والی آیت کریمہ میں کی گئی ہے۔

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃ	اور (یہی نہیں بلکہ وہ ان کو) اپنی ذات پر مقدم رکھتے ہیں (ان کی ضروریات کو ترجیح دیتے ہیں) اور اگرچہ خود ان کو شدید ضرورت (ہی کیوں نہ) ہو
(الحشر، ۹:۵۹)	

قرآن حکیم نے مومن بندوں کی صفات ایک مقام پر یوں بیان فرمائی ہیں۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًاO وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًاO

(الفرقان، ۲۵:۶۳،۶۴)

اور (خدائے) رحمان کے (مقبول) بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل (اکھڑ) لوگ (ناپسندیدہ) بات کرتے ہیں تو وہ سلام کہتے (ہوئے ایک طرف ہو جاتے) ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیام میں راتیں بسر کرتے ہیں۔

ارشادِ خداوندی کی رو سے یہ اللہ کے وہ بندے ہیں جو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں کہ کہیں ان کی ذات سے کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو جائے اور اگر کوئی ان سے زیادتی کر بیٹھے تو نہ صرف یہ کہ اسے معاف کر دیتے ہیں بلکہ اس کی سلامتی کی دعا کرتے ہوئے آگے گزر جاتے ہیں۔ آیۂ کریمہ میں اللہ کے بندوں کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ ان کا کوئی عمل دوسروں کے لئے تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ کوئی انہیں تکلیف پہنچائے تو معاف کرتے ہوئے اس کی سلامتی کے لئے دست بدعا ہوتے ہیں۔ تیسری صفت یہ کہ ان کی راتیں اللہ کے حضور حالتِ سجود و قیام میں گزرتی ہیں۔ ذہن میں رہے کہ یہی دو صفتیں حقوق العباد اور تیسری صفت حقوق اللہ سے متعلق ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ دین مجموعی طور پر حقوق العباد اور حقوق اللہ سے عبارت ہے، کسی بھی ایک کو دوسرے سے جدا کرنے سے دین کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔

اس سلسلے میں ایک حدیث قدسی کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ حضور ﷺ نے

فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک شخص کو پکڑ کر فرمائے گا: اے شخص میں دنیا میں بیمار تھا تو میری عیادت کے لئے نہ آیا، میں پیاسا تھا تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پینے کے لئے پانی نہ دیا، میں بھوکا تھا تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے مجھے کھانے کے لئے کچھ نہ دیا۔ وہ شخص کہے گا کہ باری تعالیٰ یہ کیونکر ممکن ہے تو رب العالمین ہے۔ تو تو ان چیزوں سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ جواب دے گا کہ اے نادان تیرے محلے میں فلاں شخص بیمار تھا تو اس کی بیمار پرسی کے لے نہ گیا۔ اگر تو وہاں جاتا تو مجھے میری عزت کی قسم تو مجھے اس کے ساتھ پاتا۔ اس طرح ایک پیاسے نے میرے نام پر پانی مانگا جو تو نے دینے سے انکار کر دیا۔ اگر تو اسے پانی دیتا تو مجھے میری عزت کی قسم تو مجھے اس پیاسے کے ہمراہ پاتا۔ اسی طرح میرے نام پر فلاں نے کھانا مانگا، اگر تو اسے کھانا کھلا دیتا تو مجھے اس کے پاس دیکھتا اور یہ کھانا خود مجھے ملتا۔‘‘

صحیح المسلم ،۲: ۳۱۸، کتاب البر والصلہ ،رقم حدیث: ۲۵۶۹

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یاد کرانا چاہتا ہے کہ اگر وہ میرا فضل اور رحمت تلاش کرنا چاہتے ہیں تو میرے بندوں پر احسان کریں کہ اس طرح وہ میرے انعام واکرام کے مستحق بن جائیں گے۔

75 مومن کے ایمان کی کسوٹی

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص میں یہ تین باتیں پائی جائیں اسے حلاوتِ ایمان نصیب ہوگی: (۱) اللہ اور اس کا رسول ﷺ اسے سب سے زیادہ محبوب ہوں۔ (۲) اگر اسے کسی سے محبت ہو تو صرف اللہ کے لئے ہو۔ (۳) وہ کفر کی طرف لوٹ جانے کو اسی طرح ناپسند جانے جس طرح وہ آگ میں ڈالے جانے کو جانتا ہے۔ (صحیح البخاری، ۱:۷، کتاب الایمان، رقم حدیث: ۱۵)

ایک اور روایت جو ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ نے بیان کی ہے اس طرح ہے:

قال رسول اللہ ﷺ لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده و الناس اجمعین (صحیح البخاری، ۱:۷، کتاب الایمان، رقم حدیث: ۱۵)	رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کو ماں باپ اولاد اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایمان کے بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کی یہ روایت بھی ہمارے لئے سرمایۂ ہدایت ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا۔

لانت احب الّی من کل شیی ء الا نفسی التی بین جنبی فقال له	میرے دونوں پہلوؤں کے درمیان جو میری جان پوشیدہ ہے اس کے علاوہ

النبی لن یومن احدکم حتی اکون احب الیه من نفسه فقال عمر: والذی انزل علیك الکتاب لانت احب الیّ من نفسی التی بین جنبی فقال له النبی ﷺ الآن یاعمر۔

(الشفاء،۲:۱۵)

آپ ﷺ مجھے سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ یہ ارشاد سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ اگر ایسا ہے تو قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق و صداقت والی کتاب کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا آپ میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: اے عمر اب تمہارا ایمان مکمل ہوا۔

ایک اور روایت جو سہل بن عبداللہ تستری نے بیان کی، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص سرورِ دو عالم ﷺ کی ولایت اور حکومت کو ہر جگہ اور ہر حالت میں تسلیم نہیں کرتا وہ سنت نبوی ﷺ کی حلاوت کو محسوس ہی نہیں کر سکتا کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ میری ذات کو جان، مال، اولاد اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ (الشفاء،۲:۱۵)

اللہ پر ایمان اس وقت تک مکمل ہو ہی نہیں سکتا جب تک حضور ﷺ سے تعلقِ محبت پختہ اور محکم نہ ہو جائے۔ گویا رسالت پر ایمان ہو تو ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ النُّوۡرِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلۡنَا (التغابن، ۶۴:۸)	پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور اس نور (قرآن پاک) پر جو ہم نے نازل کیا۔

ایک دوسری آیت میں یوں ارشاد فرمایا:

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا○ لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ (الفتح، ۴۸:۸۔۹)	بے شک ہم نے آپ ﷺ کو (لوگوں کے احوال کا) گواہ اور ان کو خوشخبری سنانے والا اور (عواقب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے تا کہ (اے لوگو!) تم اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لاؤ۔

ان آیات سے یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ حضور ﷺ پر ایمان لانا ہر شخص کے لئے ضروری ہے، اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان پورا نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ اسلام لانا بھی درست نہیں ہوسکتا۔

اس حوالے سے قاضی عیاضؒ نے ایک روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں۔

الایمان به ﷺ هو تصديق نبوته و رسالة الله له و تصديقه فى جميع ما جاء به و ما قاله و مطابقة تصديق القلب بذالك شهادة اللسان بانه رسول الله ﷺ فاذا اجتمع التصديق به بالقلب و النطق بالشهادة	حضور ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت، سرور دو عالم ﷺ کی نبوت و رسالت اور احکامِ الٰہی جو حضور ﷺ کے ذریعہ سے موصول ہوئے ہیں ان سب کا زبانی اقرار اور دل سے تصدیق کرے اور جب یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں گی تب ایمان مکمل ہوگا اور

بذالك باللسان تم الايمان به والتصديق له۔

تصدیق درست ہوگی۔

(الشفاء،۲:۳)

ان روایات سے جہاں رسالت پر ایمان کی اہمیت واضح ہوتی ہے وہاں یہ بات بھی پوری طرح کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضور ﷺ سے تعلق اور نسبت قائم کئے بغیر ایمان اور اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ رسالت پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان آقائے دو جہاں ﷺ کی چوکھٹ پر اپنا سر اس طرح جھکا دے کہ عقل، فکر اور فلسفے کا کوئی عمل دخل باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ عقل کے چراغ جلا کر درِ مصطفےٰ ﷺ سے ایمان کی دولت حاصل نہیں کی جاسکتی۔

76 نیکی اور تقویٰ کا قرآنی تصور

قرآن حکیم کی رو سے نیکی اور تقویٰ سے ایسے کام مراد ہیں جن سے براہِ راست کسی کو فائدہ پہنچے نہ کہ ایسی نیکیاں جو محض اجر و ثواب اور روحانی ترقی کا باعث بنتی ہیں۔

قرآن حکیم نے ایک مقام پر اس کی وضاحت ان الفاظ سے فرمائی ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔	(لوگو) تم نیکی (میں کمال) ہرگز حاصل نہ کر سکو گے۔ جب تک اپنی پیاری چیزوں سے کچھ (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے۔
(آل عمران، ۳: ۹۲)	

اس آیۂ کریمہ میں نیکی کے تصور کو منفی انداز سے بیان کرتے ہوئے یہ نکتہ سمجھایا جا رہا ہے کہ لوگو تم نیکی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، جب تک تم اپنے مال سے وہ چیز نہ خرچ کر ڈالو، جسے تم بہت محبوب رکھتے ہو۔ ''حتی تنفقوا مما تحبون'' کے الفاظ پکار پکار کر اس تصور کو سرے سے رد کر رہے ہیں کہ وہ نیکی ہے ہی نہیں، جس میں مخلوق خدا کی نفع بخشی اور فیض رسانی کا پہلو نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے ماننے والوں سے خطاب فرماتے ہیں کہ مجھے تمہاری نیکیوں، تمہارے رکوع و سجود اور تسبیحات کی رتی بھر پروا نہیں اور تمہارے یہ اعمال میری ربوبیت میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کرتے اور اگر تم انہیں چھوڑ بھی دو، میری عظمت والوہیت میں رائی بھر فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تم نیکیاں میری خاطر کرتے ہو، لیکن اگر تمہارا حال یہ ہے کہ میری مخلوق کی بے چارگی، بے بسی اور غربت و افلاس پر تمہارا دل

پریشان نہیں ہوتا اور تم ان سے بے خبر رہتے ہو، تو مجھے تمہاری نیکیوں کی کوئی پروا نہیں۔ تم میری ربوبیت کے محتاج ہو مگر میں تمہاری ان نیکیوں کا محتاج نہیں جو میری مخلوق کے لئے نفع اور فیض کا ذریعہ نہیں بنتیں۔ تم جو چاہو کرتے پھرو، جب تک اللہ کی راہ میں اس مال و دولت کو بے حساب خرچ نہ کرو جسے تم بچا بچا کر اپنی تجوریوں اور بینک بیلنس کی زینت بناتے ہو اور جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہو۔

قرآنِ حکیم نے ہمارے لئے نیکی کا ایک اصول وضع کر دیا ہے، جس کے پیمانے پر ہم بندگانِ خدا کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا اندازہ لگائیں اور دیکھیں کہ ہم ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ ہم مسجد و منبر اور اپنی مجالس میں نیکی کا جو تصور بیان کرتے ہیں اگر اس کا موازنہ قرآن کے بیان کردہ تصور سے کریں تو ہم پر وہ تضاد واضح ہو جائے گا، جس کا مظاہرہ ہم اپنی عملی زندگی میں کرتے ہیں۔ ہم مساجد میں باجماعت نماز پنجگانہ بھی ادا کرتے ہیں، ہر سال حج اور عمرہ بھی کر لیتے ہیں، روزانہ وظائف و تسبیحات بھی ہمارا معمول ہے، لیکن اس کے ساتھ دُکھی اور پریشان حال مخلوق کی طرف سے ہم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، انہیں ادا کرنے کی طرف کبھی دھیان نہیں دیتے۔ غریبوں اور بے کسوں کی حالت زار سے آنکھیں چرا لینا ہمارا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ قرآن ہمیں بار بار یاد دلا کر رہا ہے کہ اگر ذہن میں نیکی کا یہ تصور رکھ کر ہم اپنے آپ کو نیکوکار سمجھنے لگیں تو یہ ہماری بہت بڑی بھول ہوگی اور کوئی بعید نہیں کہ کل روزِ قیامت اللہ جل شانہٗ ہماری ان نیکیوں کو ہمارے منہ پر دے ماریں اور ارشاد فرمائیں کہ ہماری نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اگر کوئی حاجی نمازی یا سخی کہلاتا ہے تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی عمل نیکی نہیں لکھا جاتا، جب تک اس کا وجود دوسروں کے لئے نفع و فیض کا سرچشمہ نہ بن جائے۔ قرآنِ حکیم کی نظر میں اس وقت تک تمہارے اعمال، نیکیاں نہیں لکھے جائیں گے، جب تک دُکھی،

پریشان حال مخلوق کی فاقہ کشی اور بُھوک کا علاج نہ ہو اور سسکیاں لیتی ہوئی انسانیت کے مسائل کا حل نہ نکالا جائے۔

اس زمانے میں جس بات کو نیکی سمجھا جانے لگا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے، جس کی تلقین ہمیں حضورﷺ نے فرمائی تھی اور جو قرآنی تعلیمات کا منشا و مقصود ہے۔ نیکی کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان دوسروں کے لئے دستِ تعاون دراز کرے۔ ان کی حاجت روائی کرے اور اسے جتنے وسائل اللہ نے دے رکھے ہیں، انہیں خلقِ خدا کی مالی حاجت پوری کرنے میں صرف کر دے۔ اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ جس کی مدد کی جا رہی ہے وہ سائل کی طرح اس کے آگے اپنی گردن جھکائے رکھے۔ اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کی عزت نفس کو مجروح کیا جائے بلکہ اگر کسی محروم کو کچھ دیا جاتا ہے تو اسے اس کا حق تصور کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ○	اور جن کے مال میں حقداروں کا حق
لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ○	مقرر ہے۔ مانگنے والوں کا اور نہ مانگنے
(المعارج، ۷۰: ۲۴۔۲۵)	والوں کا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مالدار لوگوں کے مال کے اندر سائلوں محتاجوں اور محروموں کا حق ہے اور حقدار کو یہ حق دینا احسان نہیں بلکہ ایک فریضہ ہے۔ جس کی ادائیگی کے بارے میں روزِ قیامت اس سے سوال پوچھا جائے گا۔ قرآن حکیم ایسے مالداروں کو سخت الفاظ میں وعید کرتا ہے جو اپنے مال کو جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے غرباء اور ناداروں کی مدد پر خرچ نہیں کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد دولت کے پجاریوں سے سوال کرتا ہے کہ کیا محروموں کو ان کا حق نہ دے کر یہ تجوریاں، یہ بینک بیلنس تمہیں دوزخ کی آگ سے بچا سکیں گے؟ یہ آیت جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر انسان کو اس بات پر توجہ دلا رہی ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙO الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗO يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ Oكَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِO

(الھمزۃ،۱۰۴:۱۔۴)

خرابی ہے ہر اس شخص کے لئے جو (سامنے) طعنہ دیتا ہے اور (پیٹھ پیچھے) عیب جوئی کرتا ہے، جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دنیا میں ہمیشہ رکھے گا، ہرگز نہیں (اس کا مال اس کی اولاد سب یہیں چھوٹ جائے گی) وہ یقیناً حطمہ میں ڈال دیا جائے گا۔

قرآن عذاب سے ڈرا کر یہ تصورانسانی ذہن میں بٹھانا چاہتا ہے کہ اپنے مال سے دوسروں کا حصہ نکالنا ان کا فرض اور یہ حق دار کوان کا حق دینا ہے۔

77 فسادِ قلب (دل کا بگاڑ) کے علاج کا قرآنی منہاج (۱)

آج مجموعی طور پر ہمارے اندر تمام خرابیاں، برائیاں اور فتنے اس سبب سے پیدا ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے تعلقِ بندگی کے نتیجے میں ہمیں جیسا بندہ ہونا چاہیے تھا نہیں رہے۔ اس وقت المناک صورت حال یہ ہے کہ نہ ہم سے حقِ بندگی ادا ہو رہا ہے اور نہ ہمیں واقعتاً اس کی پرواہی ہے۔ یہ کیفیت دل کے بگاڑ یعنی فسادِ قلب کی وجہ سے ہے جس کی دو صورتیں نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق بندگی کٹ گیا ہے یا کمزور پڑ گیا ہے۔ دوسرا سبب حضور ﷺ سے ہمارا تعلقِ غلامی عملاً ختم ہو چکا ہے اور نہ ہونے کے برابر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا جواب ہے کہ روحانی امراض کی تشخیص، اسباب کی معرفت اور طریقِ علاج کا بنیادی اُصول قرآنی منہاج میں پوشیدہ ہے جس سے ہماری مراد مسیحائی کا وہ انداز ہے جو قرآن نے ہم پر واضح کیا ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ ہم ہر امر کی حقیقت جاننے کے لئے قرآن حکیم سے سند لیتے ہیں۔ لیکن اس سند لینے میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا غلطی کے امکان کو ختم کرنے کے لئے ہم حضور ﷺ کی سنت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اس کی مزید تائید و توثیق کے لئے ہم حضور ﷺ کی امت کے اولیاء، صلحاء، ائمہ کرام اور اکابر علماءِ حق کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ انسانی علم و عقل، فہم اور طریقِ عمل کی کوئی کمزوری اور کجی ہماری راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ طریقۂ اسلاف اور بزرگانِ دین کے راستے پر گامزن ہونے کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے حضور

روزانہ درخواست گزار ہوتے ہیں:

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ O صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ. (الفاتحہ:۵۔۶)

ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام فرمایا۔

اب المیہ یہ ہوا کہ لوگوں نے قرآنی منہاج کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ کسی نے فقط ''قرآن'' کو لے لیا اور محض اپنی عقل کی قوتوں سے مرادِ قرآن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھائیں اور کسی نے قرآن کو چھوڑ کر محض حدیث کو لے لیا۔ ہم قرآن کے منہاج کو بحال کرنے کے لئے تمام ٹکڑے اکٹھا کرنا چاہتے ہیں اور اس امر کے متمنی ہیں کہ لوگ اس منہاج القرآن پر عمل پیرا ہو جائیں۔ جو اس کی اصل روح ہے۔

انسانی شخصیت میں قلب (دل) وہ حاکم قوت ہے جو پورے انسانی وجود پر ہمہ وقت اپنی مرضی مسلط کر کے اسے اپنے تابع کرنا چاہتی ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قلب عقل وفکر کی قوتوں پر غالب ہے۔ اسی سے انسانی شخصیت کے مختلف اطوار اور رویے جنم لیتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اگر دل اپنی صفات عالیہ سے محروم ہو جائے تو اعضاء کی حسی قوتوں کو کاملیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کی تصدیق قرآن حکیم نے اس انداز میں کی ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌO (البقرہ،۲:۷)

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑ گیا) ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

دل اور کان پر مہر لگا دینے اور آنکھوں پر پردہ پڑنے سے مراد یہ ہے کہ اب یہ کافر

نہ حق بات سمجھتے ہیں اور نہ سچی بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نہ حق کو دیکھتے ہیں۔ گویا یہ محروم ہیں اور ان کے نورِ ایمان پر کفر کی تاریکیاں چھا گئی ہیں۔ آگے چل کر مزید ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں جن سے حق کی طرف لوٹنے کی صلاحیت ہی سلب ہوگئی ہے۔ قرآن حکیم نے ایک اور مقام پر اس حقیقت کی تائید یوں کی ہے کہ ان کی ظاہری آنکھیں اندھی نہیں بلکہ ان کے سینوں کے اندر جو دل ہیں وہ اندھے ہو چکے ہیں کہ نہ حق کو سمجھتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ دل کی اہمیت کس قدر ہے۔ اگر وہ بگڑ جائے تو جیتا جاگتا انسان اپنے اعضاء صحیح وسالم ہوتے ہوئے بھی سمجھنے بوجھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی بیان کردہ اس حقیقت کی تصدیق آقائے دو جہاں ﷺ کے اس فرمان سے ہو جاتی ہے۔ حدیث کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

''خبردار بے شک جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب وہ درست ہو جائے تو تمام جسم درست رہتا ہے اور جب اس میں فساد یا بگاڑ پیدا ہو جائے تو سارا جسم فساد زدہ ہو جاتا ہے۔ اور خبردار ہو جاؤ کہ یہ دل ہے۔

(صحیح البخاری، ۱:۱۳، کتاب الایمان، رقم حدیث:۵۲)

گویا جب قلبی احوال درست ہوں گے تو انسان کی شخصیت تعریف کے قابل ہو گی اور اگر قلب حرص لالچ، تکبر اور ہوا وہوس سے بھرا ہوگا تو اس کی شخصیت تباہ ہو کر رہ جائے گی اور وہ ''احسنِ تقویم'' کی منزل سے گر کر ''**اسفل السافلین**'' کے گڑھے میں غرق ہو جائے گا۔

78 فسادِ قلب (دل کا بگاڑ) کے علاج کا قرآنی منہاج (۲)

اب ہم اختصار کے ساتھ فسادِ قلب کی پہلی صورت کے علاج کی طرف آتے ہیں جو (۱) صحبتِ صلحاء اور (۲) ذکرِ الٰہی سے میسر آتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) صحبتِ صلحاء: فسادِ قلب کے علاج کا مقصد یہ ہے کہ انسانی شخصیت تمام روحانی کمزوریوں، شہوانی قوتوں کے غلبے اور خواہشِ نفس کی اکساہٹوں سے محفوظ ہو جائے۔ اس کے اندر روحانی قوت سے پاکیزگی پیدا ہو جائے اور وہ اللہ کے ساتھ تعلقِ بندگی اور اور اس کے محبوب رسول ﷺ سے تعلقِ غلامی استوار کرنے کے لئے بے قرار ہو جائے۔ یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کی زندگی کا لمحہ لمحہ اللہ اور رسول کی محبت سے سرشار ہو جائے گا۔ باطن کے اندھیرے دور ہو جائیں گے۔ شقاوت (یعنی بدبختی اور تنگ دلی) سعادت میں بدل جائے گی اور اس کے قلب و روح تعلق باللہ کے نور سے جگمگا اٹھیں گے۔ پھر غلامیٔ رسول اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دے گی اور ایسے انسان کو مقامِ تسخیر حاصل ہو جائے گا۔ جس میں کاتبِ تقدیر اپنا قلم بندۂ مومن کے ہاتھ تھما دیتا ہے اور اس کا حال بقول اقبال

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

کا مصداق بن جاتا ہے۔ قرآنی منہاج اور صحبت علماء کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط (المآئدہ، ۵:۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے الگ شریعت اور کشادہ راہِ عمل بنائی ہے۔

چونکہ فسادِ قلب کے علاج کا مقصد یہ ہے کہ اللہ سے ٹوٹے ہوئے تعلق کو جوڑ کر پھر سے بحال کرنا ہے، ایسا صرف اللہ کے بندوں کی صحبت ہی سے ممکن ہے۔ اس صحبت کی بحالی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ بیٹھ کر محبوبِ حقیقی کی باتیں کی جائیں اور اللہ کے نیک اور صالح بندوں کے ذکر سے دل کی تاروں کو چھیڑا جائے۔ اسی طرح ان کی صحبت کی یاد زندہ ہوگی اور دلوں پر کیفیاتِ عشق و مستی وارد ہونگی۔ یاد رہے کہ وہ شخص جس نے اللہ کے بندوں کی صحبت کو ترک کر دیا وہ اللہ کی بندگی کا راز نہیں پا سکتا اور وہ ان لذتوں اور حلاوتوں سے محروم رہتا ہے جن کے فیضان سے دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ افرادِ امت میں جس طبقے کو سب سے زیادہ عزت اور شرف ملا وہ صحابہ ہی تھے۔ صحابہ کرام کی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز شرفِ صحبت تھا۔ دنیا کے ولایت میں جو مقام شہنشاہِ اولیاء سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؓ کو حاصل ہوا اسے دنیا جانتی اور مانتی ہے لیکن ایک ادنیٰ صحابی کو صحبتِ مصطفوی ﷺ سے جو درجہ ملا محبوب سبحانی سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ جیسے شہنشاہِ ولایت بھی اس سے پیچھے رہ گئے۔

آج ہماری اولیں ضرورت ان صحبتوں کے احوال کو زندہ کرنا ہے جن سے طلب پیدا ہوتی ہے اور جب طلب تڑپ بن جائے تو مدعا ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ پس فسادِ قلب کے قرآنی منہاج کا نقطۂ اول صحبت ہے، جس کا حکم خود قرآن نے دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ.

(اے میرے بندے!) تو اپنے آپ کو ان لوگوں کی سنگت میں جمائے رکھا کر جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی رضا کے طلبگار رہتے ہیں (اس کی

(الکھف، ۲۸:۱۸) دید کے متمنی اور اس کا مکھڑا تکنے کے آرزو مند ہیں) تیری (محبت اور توجہ کی) نگاہیں ان سے نہ ہٹیں۔

ہمیں قربتِ الٰہی حاصل کرنے کا راز بتایا جا رہا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں رب مل جائے تو پھر ان کی صحبت میں بیٹھا کرو جن کا ہر لمحہ یادِ محبوب میں گزرتا ہے اور ان کا تعلق کبھی اللہ سے نہیں ٹوٹتا۔ یہ خدا کے بندے وہ ہیں جو سوتے، جاگتے، اور خلوت و جلوت میں اپنے مولا کی یاد میں محو رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم اللہ کو پانا چاہتے ہو تو ایسے مردانِ باخدا کے دامن کو تھامے رکھو۔ ان پر اپنی نگاہیں ٹکائے رکھو اور ان سے لو لگا لو۔ اس طرح تمہارا تعلق جو ٹوٹ گیا ہے پھر اللہ سے جُڑ جائے گا۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کے الفاظ ''ولا تعد عینك'' بندۂ حق کو عشق کا سبق دے رہے ہیں۔ اس کو تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ مولا صفات بندوں کی صحبت کو اختیار کئے رہے اور اپنے دھیان کی نگاہیں ان آنکھوں پر مرکوز رکھے جو محبوب کو تکتی رہتی ہیں اور اس کے لئے روتے رہنا ان کا شعار بن گیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنا قرب عطا کرنے کے لئے پہلے اپنی محبوب شخصیت بھیجی اور بعد میں کتاب نازل کی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ شخصیت کی تعمیر بندگانِ خدا کے ہاتھوں ہی سے عمل میں آتی ہے اور اس کے لئے صحبت کے بغیر چارہ نہیں۔ دین قیل و قال کا نہیں بلکہ حال کا نام ہے۔ جب نماز کے احکام وارد ہوئے تو ان کی تفصیل جاننے کے لئے صحابہؓ نے حضور ﷺ سے عرض کی: آقا ﷺ! ہم نماز کیسے ادا کریں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا ہوا دیکھتے ہو۔ مجھے دیکھ کر تمہیں نماز پڑھنے کا سلیقہ اور قرینہ آ جائے گا۔ لہٰذا صحبت وہ دولت ہے جو حضور ﷺ کے بعد نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے اور اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

79 فسادِ قلب (دل کا بگاڑ) کے علاج کا قرآنی منہاج (۳)

اب ہم فسادِ قلب کے دوسرے علاج کی طرف آتے ہیں جو ہے ذکرِ الٰہی۔

قرآنی منہاج کا اوّلین نکتہ صحبتِ علماء تھا تو اس کا دوسرا نکتہ ذکرِ الٰہی کی کثرت ہے۔

ذکرِ الٰہی جب سینوں میں موجزن ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ذوق وعشق کے سمندر کی لہریں ہمارے دل کی کشتی کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں اور ہم سب کشتی میں سوار ذکرِ الٰہی کے چپوؤں سے منزلِ مراد کی طرف جا رہے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ زندگی کے سارے کیف وسرور، لذتیں، حلاوتیں اور مسرتیں اسی ذکرِ الٰہی سے قائم ہیں۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ جب اللہ جل جلالہ کے ذکر کی مجلس ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے جو زمین پر گھومتے رہتے ہیں، جہاں جہاں انہیں اللہ کے ذکر کی مجلس مل جائے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک متفق علیہ حدیث کے مطابق حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے مقرر شدہ فرشتے ہیں جو اہلِ ذکر کی تلاش میں مختلف راستوں اور گلیوں کا چکر لگاتے رہتے ہیں، انہیں جہاں بھی ایسی مجلس نظر آ جائے جہاں اللہ کا ذکر ہو رہا ہو تو وہ باقی فرشتوں کو آواز دے کر بلاتے ہیں (دوسری روایت میں ہے) بے شک اللہ تعالیٰ کے ایسے ملائکہ ہیں جو زمین میں مجالسِ ذکر کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں، جب انہیں کوئی ایسی مجلس مل جائے جس میں ذکرِ الٰہی ہو رہا ہو تو وہ ان اہلِ مجالس کے ساتھ بیٹھ کر اس میں شریک ہو جاتے ہیں اور وہ ملائکہ اپنے پروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پوری مجلس پر اس طرح چھا ہو جاتے ہیں کہ ان کے اور آسمانِ دنیا کے درمیان ساری فضا ان سے معمور ہو جاتی ہیں۔

(صحیح المسلم، ۲: ۳۴۴، کتاب الذکر والدعاء، رقم حدیث: ۲۶۸۹)

اس ضمن میں شاہ ولی اللہؒ فیوض الحرمین'' لکھتے ہیں:

''میں مکہ معظّمہ میں تھا۔ حضورﷺ کے میلاد کی ایک محفل منعقد ہوئی، اللہ سبحانہ اور رسولِ کریمﷺ کا ذکر جاری تھا کہ اچانک اس محفل میں اتنا نور چمکا کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے اس نور کی حقیقت سمجھنے کے لئے مراقبہ کیا تو پتہ چلا کہ اللہ سبحانہ نے ایسی مجلسوں میں شرکت کے لئے ہزاروں لاکھوں فرشتے مامور فرما دیے ہیں جو مجلس میں انوار کی جولانیوں کا باعث بنتے ہیں''

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ کوئی شخص خواہ اپنے دل میں کتنا ہی زنگ، سیاہی، ذہنی پراگندگی، روح کی تاریکی، غفلت اور ہوا و ہوس جیسی آلائشوں اور بیماریوں سے محفل ذکر میں شریک ہوا ہو اگر وہ تسلسل سے اہل اللہ کی صحبت کو اپنائے رکھے اور کثرت سے ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ذکر کی برکت سے اس کے دل کی دنیا نہ بدل جائے اور اس کے شب و روز تبدیل نہ ہو جائیں۔

بعض احباب یہ شکوہ کرتے ہیں کہ محافلِ ذکر میں شرکت کے باوجود انہیں لذت و سرور کی کیفیات نصیب نہیں ہوتیں اور وہ حضوری کی حلاوت سے محروم رہتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ کیفیات کا حاصل ہونا ذکر کا مقصود و مطلوب نہیں۔ ذکر کا مقصد صرف محبوب کو یاد کرنا ہے۔ یہ خیال درست نہیں کہ چونکہ وہ سرور و لذت سے محروم ہیں اس سے شائد ان کا ذکر مقبول نہیں ہوا۔ یہ محض مغالطہ ہے مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جب بندہ ایک بار اللہ کا نام لیتا ہے تو دوسری بار اس وقت تک اس کے لبوں پر اللہ کا نام نہیں آتا جب تک پہلا قبول نہ ہو جائے۔ بندے کا مسلسل اللہ اللہ! کرتے چلے جانا توفیقِ الٰہی کی دلیل ہے کہ دوسری بار نام لینے کی توفیق قبولیت کے بعد ہی ملتی ہے۔ اس پر شاہد یہ ارشادِ ربانی ہے:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ سوتم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔

(البقرہ،۲:۱۵۲)

لہٰذا جب بندہ ایک بار اللہ کا نام اپنی زبان پر لاتا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ جواب میں اللہ بھی کم از کم ایک بار اُسے یاد نہ کرے۔ وہ ربِ کریم جو اپنے بندوں کو دستورِ حیات دیتے ہوئے احسان کی روش پر چلنے کی تلقین فرماتا ہے:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ اور احسان کا بدلہ بھی احسان کے سوا کیا ہے؟

(الرحمٰن،۵۵:۶۰)

وہ خود کس درجہ احسان کا پاس فرماتا ہوگا اور اس اللہ رب العزت کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لئے (بطور اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں

(الانعام،۶:۱۶۰)

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جو بندہ ایک نیکی کرے گا اسے اس جیسی دس نیکیاں عطا کی جائیں گی۔ 'امثالھا' کی اس حقیقت کو ذہن نشین رکھتے ہوئے جب ہماری نظر سورۃ البقرہ کی اس آیت کی طرف جاتی ہے تو اللہ کا بندے پر احسان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جب بندہ ایک بار اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ ذاتِ کریمانہ دس بار اپنے اس بندے کو یاد کرتی ہے۔

80 مطالعۂ سیرت کی ضرورت و اہمیت

حضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ بالعموم تین صورتوں پر مشتمل ہے: (۱) بیانِ فضائل (۲) بیانِ شمائل (۳) بیانِ خصائل۔ موجودہ زمانے میں آپ ﷺ کے ذکرِ جمیل کی اہمیت پہلے سے کئی درجہ بڑھ گئی ہے اور اس امر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضور ﷺ کی واقعاتی اور تعلیماتی سیرت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے کمالات و شمائل کا تذکرہ بھی کیا جائے تاکہ قاری کے دل میں عشق و محبت کے جذبات کے ساتھ سیرتِ محمدی ﷺ کے مطالعے کا شوق پیدا ہو اور جس سے اس کے اندر حضور ﷺ کی تعلیمات اپنانے کی عملی ترغیب پیدا ہو جائے۔ اب ہم اوپر بیان کردہ سیرت کے تین پہلوؤں کا مختصر جائزہ لیں گے۔

۱۔ فضائل سے مراد حضور نبی اکرم ﷺ کے بحیثیت پیغمبر وہ امتیازات و کمالات اور معجزات ہیں جو آپ ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے۔ ان کے ذکر کا اولین مقصد یہ ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی عظمت کا نقش دل پر ثبت ہو جائے۔ اگر یہ تصور پختہ ہو جائے تو اس سے اسلام کی صداقت اور حقانیت کی بہت بڑی دلیل ہاتھ آجاتی ہے۔ قرآن حکیم میں انبیاء کرام کو عطا کردہ معجزات کے بیان کا بنیادی فلسفہ ہی یہی تھا کہ مسلمانوں کے اندر رسولِ آخر حضور ﷺ سے رشتۂ ادب و تعظیم کو مضبوط بنایا جائے۔

۲۔ سیرتِ مصطفوی ﷺ کا دوسرا پہلو شمائل سے متعلق ہے۔ جس سے مراد حضور ﷺ کے ظاہری حسنِ سراپا کا بیان ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ اہلِ ایمان کے جذباتِ عشق و محبت کو فروغ ملے اور وہ بے اختیار آپ کی طرف کھچے چلے

آئیں۔ یہ اس لئے کہ محبتِ رسول ﷺ میں کمال درجہ کا لگاؤ اور والہانہ پن ہی اطاعت و اتباع کی حقیقی بنیاد ہے۔ اس طرح حضور ﷺ کی شخصیت، سیرت، سنت اور آپ کی ہر ہر ادا کا اثر فطری طور پر دلوں میں پیدا ہوتا چلا جاتا ہے جو فی الحقیقت مقصودِ ایمان ہے۔

۳۔ خصائل کا بیان حضور ﷺ کی عادات و اطوار اور افعال و اعمال سے متعلق ہے۔ جس سے آپ ﷺ کی عملی اور تعلیماتی سیرت کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ گویا حضور ﷺ کے حسنِ باطن کا آئینہ ہے۔ جوامت کو اپنے اعمال کے خدوخال سنوارنے میں مدد دیتا ہے۔ اس سے آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے بغور مطالعے کا موقع فراہم ہوتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں انسان اپنے عمل کی اصلاح کر سکے اور وہ اپنی زندگی کو آنحضور ﷺ کی مقدس تعلیمات کے سانچے میں ڈھال سکے۔ سیرتِ پاک کا یہ پہلو اطاعت واتباع کی طرف راغب کرتا ہے اور اسی سے ایمان میں کمال پیدا ہوتا ہے۔

یہ مقامِ افسوس ہے کہ دورِ حاضر کے بعض سیرت نگاروں نے مغربی فکر کے دانشوروں اور مستشرقین کے زیر اثر حضور ﷺ کے اکثر معجزات و کمالات کا یہ کہہ کر انکار کر دیا ہے کہ ان روایات کا تذکرہ ثقہ کتب حدیث میں نہیں اور امام بخاری و امام مسلم جیسے ائمہ حدیث نے انہیں بیان نہیں کیا۔ لہٰذا یہ روایات صحت اور ثقاہت کے بلند معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ہم کمال دیانتداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ قطع نظر اس سے کہ ان روایات کا فنِ حدیث میں کیا مقام ہے اور خود اُصولِ حدیث اور فن رجال کے علماء نے احادیث احکام و فضائل کے ردوقبول کے کیا کیا پیمانے اور اصول وضع کر رکھے ہیں۔ ان معجزاتِ محمدی ﷺ کی روایات کے قبول و انکار کا مسئلہ صرف روایات کے قبول اور عدم قبول کا مسئلہ نہیں بلکہ زاویۂ نگاہ کا مسئلہ ہے۔ یہ معاملہ فنی نہیں فکری ہے، تحقیقاتی نہیں، نظریاتی ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ بعض علمائے دین جو اہمیت حضور ﷺ کی تعلیمات کو دیتے ہیں وہ آپ کے نبوی کمالات و فضائل کو دینے کے لئے تیار نہیں بلکہ ان کے نزدیک یہ پہلو اتنا اہم ہی نہیں کہ اس کا ذکر کیا

جائے۔ وہ اہمیت فقط آپ ﷺ کی عملی وتعلیماتی سیرت کو دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہی دین وایمان کی بنیاد ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ حبی اور قلبی تعلق رکھنے پر یقین نہیں رکھتے اور تقاضائے دین کی تکمیل کے لئے فقط آپ ﷺ کی ہدایات وتعلیمات سے ذہنی، فکری اور عملی نسبت قائم ہونے ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے قلبی، وجدانی اور حبی تعلق اور نسبت پیدا ہونا شخصیت پرستی ہے اور اس پر زور دینا ان کے اپنے خودساختہ تصورِ توحید کے منافی ہے۔ نتیجتاً ایسی تمام احادیث اور روایات کا ذکر کرتے ہوئے جن کے ذریعے حضور ﷺ کی ذاتی عظمت اور عشقِ محمدی ﷺ کی ضرورت واہمیت اور ادب وتکریمِ رسالت ﷺ کے تقاضوں پر روشنی پڑتی ہو ان کا نشترِ تحقیق زیادہ تیزی سے چلنے لگتا ہے اور ایسی تمام احادیث اور روایات جن میں یہ بیان ہو ان کے اپنے وضع کردہ تصورِ دین سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اسی لئے وہ سارے کا سارا مواد جو سیرت وفضائل نبوی کے حوالے سے قدیم ومستند کتب میں ملتا ہے جن کو قلمبند کرنے والے عام مورخین اور سیرت نگار نہیں بلکہ بلند پایہ محدث، مفسر، فقیہ اور اکابر ائمہ دین ہیں، دورِ جدید کے اکثر سیرت نگار اسے موضوع اور باطل قرار دے کر سیرت کی کتابوں سے نکالتے جا رہے ہیں تاکہ جس طرح توحید کو نسبتِ ادب نبوی ﷺ سے ''خالص'' کرنے کی مہم جاری ہے۔ اسی طرح سیرت کو بھی نسبتِ محبتِ نبوی ﷺ سے الگ کر کے ''خالص'' کیا جا سکے۔

ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کوشش ایمان کے خلاف ایک فکری سازش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ نام نہاد دینی تعلیمات اور لٹریچر کے ذریعے امت مسلمہ کا رشتۂ محبت وغلامی اپنے محبوب ومکرم نبی ﷺ سے کمزور کر کے بالآخر کاٹ دیا جائے۔ یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ سیرتِ رسول ﷺ کے دو پہلو ہیں: تعلیماتی اور جمالیاتی۔ ان دونوں پہلوؤں کو پورے نظم اور اسلوب کے ساتھ قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

81 معارفِ اسمِ محمد ﷺ (۱)

اسمِ محمد ﷺ: کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت کا حصہ

اسمِ محمد ﷺ کا لفظ اتنا پیارا موہنا اور حسین ہے کہ جسے سنتے ہی ہر نظر خود ادب سے جھک جاتی ہے' ہر سر خم ہو جاتا ہے اور زبان پر درود و سلام کے ترانے جاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن کم لوگ اس کے معنی و مفہوم سے پوری طرح آشنا ہیں۔

لفظ محمد حمد سے نکلا ہے اور حمد کے معنی تعریف اور ثنا بیان کرنے کے آتے ہیں، خواہ یہ تعریف کسی ظاہری خوبی کی وجہ سے کی جائے یا کسی باطنی وصف کی بنا پر۔ تعریف کا مفہوم ادا کرنے کے لئے شکر کا لفظ بھی بولا جاتا ہے' مگر شکر اور حمد میں فرق ہے۔ شکر سے مراد وہ تعریف ہے جو ممدوح (جس کی تعریف کی جائے) کی عظمت، نعمت اور کبریائی کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔

ہم یہاں کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت میں مذکور اسمِ محمد ﷺ کی حکمت اور معنویت بیان کریں گے۔ یوں تو حضور نبی اکرم ﷺ کے بے شمار اسمائے گرامی ہیں۔ بعض محدثین کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کو بھی ننانوے ناموں سے نوازا ہے جبکہ بعض علماء کا قول ہے کہ آپ ﷺ کے تین سو مبارک نام ہیں۔ صحیح البخاری کے شارح لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ایک ہزار نام ہیں جن میں سے ہر نام آپ ﷺ کی سیرت و کردار کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان صفاتی ناموں کے حوالے سے ایک بات بالکل واضح ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ہزاروں نام ہیں مگر ذاتی نام صرف ایک ہی ہے یعنی ''اللہ'' اسی طرح سرورِ دوجہاں ﷺ کے بھی سینکڑوں نام ہونے کے باوجود ذاتی اور شخصی نام دو

ہیں محمد اور احمد۔ اسم محمد ﷺ کی معارف جاننے سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلام کے رکن اول یعنی کلمہ طیبہ کے دو حصے ہیں: پہلا حصہ عقیدۂ توحید یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ اور دوسرا حصہ عقیدۂ رسالت رسالت یعنی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ۔ ان دونوں حصوں کو بظاہر الگ الگ خیال کیا جاتا ہے مگر امرِ واقع یہ ہے کہ شہادتِ توحید ایک دعویٰ ہے اور شہادت رسالت محمدی ﷺ اس دعوے کا ثبوت اور اس کی دلیل ہے۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک واحد اور یکتا ہونے کا یقینی علم ہمیں صرف حضور ﷺ کی ذات اور آپ کی شہادت یعنی گواہی دینے ہی سے حاصل ہوا۔

شہادتِ توحید کے دو حصے ہیں: منفی اور مثبت، پہلے حصے میں اللہ کے ماسویٰ کسی اور کے الٰہ ہونے کی مکمل نفی اور دوسرے حصے میں اللہ کی الوہیت کا اثبات کیا گیا ہے۔ مطلق لفظ الٰہ بولا جائے تو اس کا مطلب معبود ہے اور معبود کوئی بھی ہوسکتا ہے مگر جب لفظ الٰہ میں الف اور لام کا اضافہ کردیا جائے تو ''اللہ'' بن جاتا ہے اور اس سے مراد سے صرف اور صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ اسی طرح ''حمد'' کا لفظ تعریف کے لئے بولا جاتا ہے اور تعریف کسی کی بھی ہوسکتی ہے لیکن جب سے لفظ محمد ﷺ بطور اسم وجود میں آیا ہے تو اس سے مراد فقط ایک ہی ہستی، ایک ہی شخصیت اور ایک ہی ذات ہے، جسے خالقِ کائنات نے اپنے ہی نام کے ساتھ خاص کردیا تھا اور ازل سے عرش کے پایے پر لکھ رکھا تھا۔ قاضی عیاضؒ اپنی کتاب ''الشفاء'' میں لکھتے ہیں کہ آج تک دنیا میں کسی شخص نے اپنی اولاد کا یہ نام نہیں رکھا۔ اس لئے یہ نام خالقِ موجودات نے آپ ﷺ ہی کی ذات کے لئے مخصوص فرمادیا تھا۔

لفظ محمد ﷺ کا ہر حرف بامعنی ہے۔ اگر شروع کا ''م'' ہٹا دیا جائے تو ''حمد'' رہ جاتا ہے جس کا مفہوم تعریف وتوصیف ہے۔ اگر حرف ''ح'' کم کردیا جائے تو ''مد'' رہ جاتا ہے جس کا معنی مدد کرنے والا ہے۔ اگر ابتدائی 'میم' اور 'حا' دونوں الفاظ حذف کردیئے

جائیں تو باقی ''مد'' رہ جائے گا جس کا معنی دراز اور بلند ہے جو حضور ﷺ کی عظمت اور رفعت کی طرف اشارہ ہے اور اگر دوسرے میم کو بھی اڑا دیا جائے تو صرف ''د'' (دال) رہ جاتا ہے، جس کا مفہوم ہے دلالت کرنے والا۔ یعنی اسمِ محمد ﷺ اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ حضور ﷺ کے بے شمار صفاتی نام ہیں مگر آپ ﷺ کے ذاتی نام صرف دو ہیں: محمد اور احمد۔ حضور ﷺ کا اپنا ارشاد ہے کہ زمین پر میرا نام ''محمد'' اور آسمان پر احمد ہے ''احمد'' کا ذکر قرآن حکم میں سورۃ الصّف کی آیت نمبر ۹ میں ایک جگہ آیا ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو پیغمبرِ آخر الزمان ﷺ کی آمد سے اس نام سے آگاہ کیا تھا۔ ذہن میں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ﷺ نے آپ ﷺ کی آمد کی خبر زمین والوں کو سنانی تھی نہ کہ آسمان والوں کو۔ انہیں اس موقع پر زمین والے نام ''محمد'' کا ذکر کرنا چاہئے تھا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ﷺ گو زمین پر پیدا ہوئے اور زمین والوں میں رہے اور یہیں زندگی بسر کی مگر واقعتاً ان کی پیدائش سے لے کر آسمان پر اٹھائے جانے تک ان کے بہت سے احوال آسمان والوں سے مشابہ تھے اور ان کی پیدائش بھی انسانی طریقے سے ہٹ کر ہوئی، پھر مختصر ارضی زندگی بسر کرنے کے بعد وہ آسمانوں پر اٹھائے گئے۔ گویا ان کی زندگی بیشتر اعتبار سے آسمانی مخلوق سے مشابہت رکھتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ حضرت عیسیٰ نے حضور ﷺ کے اسی نام کا ذکر فرمایا جس سے آپ ﷺ کو آسمانوں پر پکارا جاتا تھا۔

82 معارف اسم محمد ﷺ (۲)

محمد ﷺ کے متعدد اسماء کی وسعت و معنویت

حضور ﷺ کے مبارک ناموں میں مادۂ حمد خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ کم از کم آپ ﷺ کے چار اسمائے مبارکہ (محمد، احمد، حامد اور محمود) میں محمد، احمد اور محمود ''تعریف کئے گئے'' کا مفہوم رکھتے ہیں۔ 'محمد' اسم مفعول اور 'احمد' اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور دونوں میں حمد کے معنی کی وسعت اور کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ حضور ﷺ کے یہ تینوں مبارک نام کثرت سے آپ ﷺ کی تعریف و توصیف کو ظاہر کرتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ کی تعریف صرف کائنات کی مخلوق یعنی جن انسان اور مقرب ملائکہ (فرشتے) ہی نہیں کرتے بلکہ خود خالقِ کائنات بھی آپ کی مدح و ثنا کرتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا	بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود اور خوب سلام بھیجا کرو۔
(الاحزاب، ۵۶:۳۳)	

یہی وجہ ہے کہ سارے کا سارا قرآن آپ کی حمد اور تعریف و توصیف سے بھرا ہوا ہے۔

یہ بات طے ہے کہ حضور ﷺ کے ذاتی نام اور شخصی نام محمد اور احمد ہیں۔ محمد کا مفہوم ہے وہ ذات جس کی بار بار اور کثرت سے تعریف کی جائے۔ احمد کا معنیٰ ہے خدا کی

سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ تعریف ہمیشہ کسی خوبی اور کمال پر کی جاتی ہے نقص اور عیب پر نہیں۔ اس اعتبار سے حضور ﷺ کے ان دو ذاتی اسمائے مبارکہ کا مفہوم از روئے لغت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے سیرت و کردار کا دامن ہر انسانی لغزش، خطا اور نقص و عیب سے مکمل طور پر پاک ہے اور آپ کی صفتِ کاملہ کا فطری طور پر موجود ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ لہذا حضور ﷺ کے ان دونوں ناموں میں آپ کے بے مثل سیرت و کردار اور خلقِ عظیم کا ہر ہر پہلو اور ہر ہر گوشہ پوری شان کے ساتھ نمایاں طور پر ظاہر ہو رہا ہے اور یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ کی ذات فطری اور جبلی طور پر ہر ظاہری اور باطنی نقص اور خامی سے پاک اور مبرّا ہے۔ اسی کو شاعرِ دربارِ نبوت حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے ان دو نعتیہ اشعار میں بڑے حسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔

وَ اَحۡسَنَ مِنۡكَ لَمۡ تَرَ قَطُّ عَيۡنٌ
وَ اَجۡمَلَ مِنۡكَ لَمۡ تَلِدِ النِّسَآءُ
خُلِقۡتَ مُبَرَّاءً مِّنۡ كُلِّ عَيۡبٍ
كَاَنَّكَ قَدۡ خُلِقۡتَ كَمَا تَشَآءُ

ترجمہ: (آپ ﷺ سے زیادہ حسین چہرہ آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور حضور ﷺ سے زیادہ خوبصورت شخص کسی ماں نے نہیں جنا۔ آپ ہر (جسمانی و روحانی) عیب سے کلی طور پر پاک اور مبرا پیدا ہوئے تھے، گویا آپ ﷺ ایسے ہی پیدا کئے گئے جس طرح آپ ﷺ خود چاہتے تھے)

حضرت حسان بن ثابتؓ نے اپنے اشعار میں حضور ﷺ کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہ آپ ﷺ کے اسم گرامی محمد اور احمد میں پوری طرح جھلک رہی ہیں، ان کا ذکر کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہر اعتبار سے اپنی

مثال آپ ہے، اسی طرح آپ ﷺ کا اسم گرامی (محمد و احمد) بھی تمام ناموں میں مثالی شان رکھتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو؟ ربِ کائنات نے اپنے محبوب کے لئے ایسا نام تجویز کیا جو انتہائی جامع اور منفرد ہے اور ایسے کمالات والا انسان نہ پہلے پیدا ہوا ہے اور نہ قیامت تک پیدا ہوگا۔

حضور ﷺ کا ظاہری حسن و جمال جس کا ذکر حضرت حسانؓ کے اشعار میں ہوا ہے آپ کے کمال درجہ حسن اور شخصی وجاہت سے عبارت ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ حضور ﷺ سے زیادہ حسین چہرہ تمام روئے زمین پر آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ گویا آپ حسنِ ظاہری کی یکتا مثال تھے اسی لئے روایات میں ہے کہ آپ اکثر دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْتَ خلقی فاحسن خلقی

اے اللہ! میری خلق (سیرت) بھی ایسی ہی حسین کردے جیسی تو نے میری خلق (صورت) حسین بنائی ہے۔

(مسند احمد بن حنبل، ۱:۴۰۳)

یہی سبب ہے کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ کے عاشقِ زار صحابہ آپ ﷺ کے حسنِ بے مثال کو یاد کر کے بے تاب ہو جایا کرتے تھے اور ان کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ وہ روئے زیبا دوبارہ ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ حضرت جابرؓ نے ایک دفعہ حضور ﷺ کے حسن و جمال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک تلوار نہیں بلکہ چاند اور سورج کی طرح چمک دار تھا۔ قاضی عیاضؒ نے ''الشفاء'' میں کم از کم پندرہ جلیل القدر صحابہ کرامؓ کا ذکر کیا ہے، جن کی متفقہ شہادت ہے کہ حضور ﷺ جسمانی حسن و جمال کے بے مثال نمونہ تھے۔ بعض نے آپ ﷺ کو مسکراتے دیکھ کر یوں محسوس کیا گویا آپ چاند کا ٹکڑا ہیں۔

83 اسمِ محمد ﷺ: خدا کی واحدانیت کی دلیل

یہ حقیقت محتاجِ بیاں نہیں کہ حضور ﷺ کا جس طرح ظاہری حسن میں کوئی شریک نہیں اسی طرح وہ اپنے باطنی حسن و جمال میں بھی بے مثال ہیں اور کائنات میں ازل سے ابدتک کوئی ایسا نہیں جوان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔یہی سبب ہے کہ خداوند تعالی کے بعد سب سے زیادہ تعریف وتوصیف آپ ﷺ ہی کے حصے میں آئی اور اسی لئے آپ ﷺ کا نام ''محمد'' رکھا گیا جس کا معنی ہے وہ ذات جس کی بہت زیادہ تعریف کی جائے۔اسی بنا پر کلمہ طیبہ میں جسے کلمہ توحید بھی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کے اسم گرامی محمد ﷺ کو اپنی وحدانیت کی دلیل کے طور پر لایا اور اس بات کا علی الاعلان چرچا کیا گیا کہ میرے واحد اور یکتا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ میرا محبوب اپنے حسن و جمال اور سیرت و کردار میں بے مثل اور یکتا ہے اور فرمایا کہ جن لوگوں کو میری توحید پر کوئی شہادت درکار ہو وہ میرے اس جیتے جاگتے محبوب ﷺ کو دیکھ لیں۔ان کی سیرتِ طیبہ اور زندگی کے محاسنِ عالیہ کا مطالعہ کر لیں انہیں اس دنیا میں توحید کی سب سے بڑی دلیل ہاتھ آ جائے گی۔وہ اس امر پر غور کریں تو انہیں یہ نکتہ سمجھ میں آ جائے گا کہ اگر اس جہاں رنگ و بو میں میرے محبوب ﷺ کی کوئی مثل نہیں ہے تو انہیں میری مثل کہاں سے مل سکے گی۔

اسی طرح حضور سید عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو خود آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی دلیل بنایا گیا۔جب آپ ﷺ نے نعرۂ توحید بلند کیا اور اس بت پرست معاشرے میں اس بات کا اعلان کرنا چاہا کہ لوگو! خدا ایک ہی ہے اور اس کی ہستی کے سوا اور کوئی ذات نہیں

جسے معبود بنایا جا سکے تو اس مقصد کے لئے قریشِ مکہ کے ایک ایک خاندان کو ''آلِ غالب'' کہہ کر کوہِ صفا کے دامن میں جمع کیا اور ان کے سامنے خدا کے ایک ہونے کے بعد اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا تو یہ ایک ایسا موقع تھا کہ لوگوں نے آپ ﷺ سے اپنے نبی ہونے کے بارے میں دلیل طلب کی، جسے دیکھ کر وہ اللہ کی وحدانیت اور آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔ اس سے پہلے انبیاء کو اس طرح کی صورت حال سے دو چار نہیں ہونا پڑا تھا، جب ان کی قوم نے انہیں نبوت کی دلیل پیش کرنے کو کہا تھا۔ چنانچہ ایسے ہی موقع پر حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے قومِ فرعون کے سامنے عصا اور ید بیضا کو بطور معجزہ پیش کیا جو ان کی نبوت کی دلیل ٹھہرا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس طرح کے موقع پر مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ پیش کر کے اپنی نبوت کا ثبوت فراہم کیا۔ اگر حضور ﷺ بھی اعلان نبوت کے اس موقع پر چاہتے تو چاند کے ٹکڑے کر دیتے، ڈوبتے سورج کو دوبارہ مغرب سے طلوع کرا دیتے، درختوں کو جڑوں سمیت اپنی طرف آنے کا حکم دیتے اور پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے، مگر حضور ﷺ نے اس موقع پر ایسا کوئی معجزہ نہ دکھایا بلکہ توحیدِ باری تعالیٰ اور اپنی نبوت کی سب سے منفرد اور سب سے نرالی دلیل پیش کی اور قرآن کے الفاظ میں یہ فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُراً مِّنْ قَبْلِهِ (یونس، ۱۰:۱۶)

میں تمہارے اندر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار چکا ہوں (مجھے دیکھ لو یہی میری نبوت کی اور اللہ کی وحدانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے)۔

یہ بہت بڑا چیلنج تھا جو حضور اکرم ﷺ نے عالمِ کفر کو دیا۔ اپنی چالیس سالہ زندگی کو توحید و رسالت کی گواہی کے طور پر پیش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ ﷺ کی سیرت کا دامن اجلی سفید چادر کی طرح بے داغ تھا اور اس پر کوئی ایسا دھبہ نہیں تھا جس پر آپ ﷺ

کے مخالفین انگلی رکھ سکتے۔ باری تعالیٰ نے آپ کو تمام خوبیوں اور محاسن سے مالا مال کر بھیجا تھا۔جس سے آپ ﷺ کا وجودِ اقدس حسنِ مطلق کی کامل دلیل بن گیا۔آپ ﷺ کا اسم گرامی محمد ﷺ بھی آپ کے ظاہری و باطنی وجود کی طرح بے مثال تھا۔محمد ﷺ کا مادہ حمد ہے اور محمد ﷺ کا معنی ہے ''جس کی بہت زیادہ مدح کی جائے'' حمد اللہ تعالیٰ کے کلام میں سب سے اول لفظ ہے **(الحمد لله رب العالمين)** اور محمد ﷺ اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سب سے پہلا فرد ہے۔گویا حمد اس کے کلام کا لفظ اول ہے اور محمد ﷺ اس کے فیضان کا نقشِ اول۔حمدِ باری تعالیٰ کی ربوبیت کا مظہر ہے اور محمد ﷺ اس کی ربوبیت کا اعجاز۔حمد صفاتِ باری تعالیٰ کی دلیل ہے اور محمد ﷺ ذاتِ باری تعالیٰ کی دلیل۔

اسی لئے خالقِ ارض وسماوات نے اپنے محبوب کو محمد ﷺ جیسے خوبصورت نام سے موسوم فرمایا جو آپ کی ذات اور شخصیت کی طرح بے مثل،آپ کی عظمت اور کمالات کو ظاہر کرتا ہے۔اقبالؒ نے کیا خوب کہا:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآن وہی یسین وہی فرقان وہی طٰہٰ

84 قرآن اور شمائلِ نبوی ﷺ (۱)

یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ جب انسان کسی ہستی کی خوبیوں اور کمالات کا قائل ہو جاتا ہے تو بے ساختہ اسے چاہنے اور پسند کرنے لگتا ہے، اس کے دل میں اس کی محبت کا پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ اسی لئے آنحضور ﷺ کی ذات جو مجموعۂ اوصاف و کمالات ہے کسی کے دل میں اتنا گھر کر جاتی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے بات بات پر کسی نہ کسی بہانے محبوب کے ذکرِ جمیل کو اپنا شعار بنا لیتا ہے اور اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے اس کے ذکر کی محفلیں سجاتا ہے۔ یاد رہے کہ اس ذکر میں عقلی اور قانونی تعلیم کا کوئی پہلو نہیں ہوتا بلکہ یہ سرتا سر اس کے جذبۂ محبت کا اظہار ہے جس سے وہ اپنے دل کی کھیتی کی شادابی اور سیرابی کا سامان کرتا ہے۔

اس تمہید باندھنے کا مقصد اس بات کا کھوج لگانا ہے کہ حضور ﷺ کے شمائل و فضائل کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے؟ کتبِ احادیث میں محدثین نے اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لیکن یہ دیکھنا اہلِ علم کا کام ہے کہ وہ اس کی تائید میں قرآنِ حکیم پر تحقیقی نظر ڈالے، اس لئے کہ قرآن سے بڑھ کر زیادہ مستند، معتبر ذریعہ اور حوالہ کوئی نہیں۔

قرآنِ حکیم نے سرورِ کائنات ﷺ کے سراپا مبارک اور حسنِ بے مثال کا ذکر ایسے بلیغ اور پیارے انداز سے کیا ہے کہ صاحبِ ذوق اسے پڑھ کر وجد میں آ جاتا ہے اور اس کے دل میں عشقِ مصطفوی ﷺ کے ایسے چراغ روشن ہو جاتے ہیں جنہیں حادثاتِ زمانہ کی کوئی آندھی نہیں بجھا سکتی۔ جب ہم اس ضمن میں قرآن حکیم کی ایسی آیات کا جن

میں حضور ﷺ کے حسنِ سراپا کا ذکر کیا گیا ہے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے وجدان کو جلا ملتی ہے۔قرآن حضور نبی اکرم ﷺ کو سراپا نور قرار دیتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيۡنٌO	بے شک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور آ چکا اور ایک روشن کتاب۔

(المائدہ، ۵:۱۵)

اس آیہ کریمہ میں دونوروں کا ذکر ہے۔ایک نورِ مجسم محسنِ کائنات اور دوسرا نور کتابِ الٰہی قرآن حکیم ہے جس کے سراپا ہدایت ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اس کی تفسیر میں متعدد ائمہ کرام نے پہلے نور سے مراد ذاتِ مصطفےٰ ﷺ ہی کو لیا ہے۔اس کی تفصیل جاننے کے لئے راقم کی کتاب ''قرآن اور شمائل نبوی'' کا مطالعہ ضروری ہے۔

حضور ﷺ کے سراپا حسن و جمال ہونے کو قرآنِ حکیم نے ایک اور مقام پر استعاراتی طور پر یوں بیان فرمایا ہے۔

اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِهٖ كَمِشۡكٰوةٍ فِيۡهَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِىۡ زُجَاجَةٍ ؕ	اللہ (ہی) آسمان اور زمین کا نور ہے اسکا نور ایک ایسے طاق جیسا ہے جس میں ایک چراغ ہے، وہ چراغ ایک فانوس میں ہے۔

(النور ۲۴:۳۵)

اس آیۂ کریمہ میں خالقِ کل نے خود کو آسمانوں اور زمین کا نور قرار دیا ہے کہ اسی کے نور نے بلاشبہ اس کائنات کے گوشے گوشے کو منور کر رکھا ہے۔لیکن مجازاً نورِ الٰہی کی مثال ایک طاق سے دی گئی ہے جس کے اندر رکھا گیا چراغ شیشے کے فانوس میں پوری عالمِ انسانی کو جگمگا رہا ہے۔اس میں قرآن استعارے کی زبان میں نورِ مصطفوی ﷺ کی نشان دہی کر

رہا ہے اور یہی نور دراصل نورِ الٰہی کا پرتو ہے جس کی نورانی کرنوں سے زمین و آسمان کے تمام گوشے منور ہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے بھی مذکورہ کتاب سے رجوع کیا جائے۔

قرآن حکیم میں ربِ کریم نے اپنے حبیب سے خطاب کرتے ہوئے ایک مقام پر آپ کے حسن و جمال کو روشن چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًاO وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًاO (الاحزاب، ۳۳:۴۵۔۴۶)	اے نبی! ہم نے آپ ﷺ کو گواہ (بنا کر) اور خوشخبری سنانے والا اور نصیحت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور (آپ کو) اللہ کے اذن سے اللہ کی طرف بلانے والا اور ایک روشن چراغ (بنا کر بھیجا ہے)۔

محبوب کے حسنِ سراپا کو ''سراج منیر'' قرار دینا ایک قرآنی استعارہ ہے۔ عربی میں ''سراج'' سورج یا چراغ کو کہتے ہیں اور منیر اسے کہا جاتا ہے جو دوسرے کو روشن کر دے۔ گویا ذاتِ مصطفوی ﷺ کا وجود ایسے چراغ کی مانند ہے جو نہ صرف یہ کہ خود روشن ہے بلکہ چاروں طرف روشنی بانٹ رہا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ، علامہ قسطلانیؒ اور محدث ابن جوزیؒ نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں جو لکھا ہے اس میں اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی جسے مذکورہ کتابچے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

85 قرآن اور شمائلِ نبوی ﷺ (۲)

نورِ مصطفوی ﷺ کے بارے میں حضرت حلمیہ سعیدہؓ کے تاثرات نقل کرتے ہوئے مشہور محدث امام ابن جوزیؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں۔

اذا ارضعته فی المنزل استغنی به من المصباح	جن دنوں میں رسول خدا کو دودھ پلایا کرتی ان دنوں مجھے گھر میں چراغ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

چنانچہ ایک دن مجھ سے حضرت خولہؓ نے پوچھا کہ کیا تم گھر میں رات کو آگ جلائے رکھتی ہو جس سے تمہارے گھر میں روشنی رہتی ہے میں نے جواباً کہا۔

لا واللہ اوقد نارا ولکنه نور محمد ﷺ (میلاد النبی:۵۴)	خدا کی قسم آگ نہیں جلاتی بلکہ یہ روشنی نور مجسم ﷺ کے نور کی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ شمائل محمدیہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ سے مروی ہے۔

ما کنا نحتاج الی السراج یوم اخذنا ہ لان نور وجھه کان انور من السراج فاذا احتجنا الی السراج فی مکان جئنا به فتنورت الا مکنة ببر کته ﷺ	جس دن سے ہم آپ ﷺ کو اپنے گھر لائے اس دن سے ہمیں گھر میں چراغ جلانے کی حاجت نہ رہی۔ کیونکہ آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس کا نور چراغ سے زیادہ منور تھا۔ جب کبھی ہمیں کسی جگہ

(تفسیر مظہری، ۶: ۵۲۸)

چراغ کی ضرورت ہوتی ہم آپ ﷺ کو اٹھا کر وہاں لے جاتے آپ ﷺ کی برکت سے تمام جگہ روشن ہو جاتی۔

حضور ﷺ کے سراپا نور ہونے کا ذکر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بیان کردہ ایک روایت میں ملتا ہے۔ آپ فرماتی ہیں:

انها كانت مع رسول الله ﷺ على فراشه فی لیله مظلمة فسقط من يدها ابرة الى الارض فكشفت عن وجه رسول الله ﷺ فوجدتها بنور جبينه فرفعتها

(جواہر البحار، ۴: ۲۲۶)

ایک اندھیری رات وہ بستر پر تھیں۔ ان کے ہاتھ سے سوئی زمین پر گر گئی (وہ تلاش کر رہی تھیں) کہ اچانک رسالتمآب ﷺ کے چہرہ مبارک سے نور کی شعاعیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ آپ ﷺ کی پیشانی کے نور کی وجہ سے مجھے گم شدہ سوئی مل گئی۔

اس روایت میں ابن عساکر نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے:

فتبينت الابرة من شعاع نور وجهه ﷺ

آپ ﷺ کے چہرہ اقدس کی چمک کی وجہ سے سوئی نظر آئی۔

(ابن عساکر، ۱: ۳۲۵)

اس ضمن میں حضرت انسؓ کی روایت کا تذکرہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں دو صحابی دور دراز کی مسافت طے کر کے حاضر ہوئے۔ انہیں باتوں باتوں میں دیر ہو گئی جب انہوں نے حضور ﷺ سے واپس جانے کی رخصت چاہی تو رات ہو گئی تھی۔ تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ بھی دکھائی نہیں

دیتا تھا۔ ان کے پاس ایک عصاء کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ اتنا لمبا سفر ہے اندھیرے میں واپس گھر کیسے پہنچیں گے؟ حضور ﷺ نے ان کی مشکل کو بھانپ لیا اور از روئے شفقت ان کے عصا کو اپنے دست اقدس میں لے لیا۔ ایسا کرنے کی دیر تھی کہ وہ عصاء مشعل (Torch) کی طرح چمکنے لگا۔ جس کی روشنی میں وہ خیر و عافیت کے ساتھ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ان اسید بن حضیر و عباد بن بشر رضی اللہ عنہما تحدثا عند النبی ﷺ فی حاجه لهما حتی ذهب من اللیل ساعة فی لیلة شدیدة الظلمة ثم خرجا من عند رسول اللہ ینقلبان و بید کل واحد منهما عصبیة فاضاءت عصا احدهما حتی مشیا فی ضوء ها حتی اذا افترقت بهما الطریق اضاء ت للاخر عصاه فمشی کل واحد منهما فی ضوء عصا حتی بلغ اهله

(مشکوۃ المصابیح:۵۴۴)

اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں بعض معاملات میں گفتگو کرتے ہوئے دیر ہو گئی۔ رات سخت اندھیری تھی جب دونوں گھر کو روانہ ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں جو عصاء تھے ان مین سے ایک کا عصاء روشن ہو گیا جس کی روشنی میں فاصلہ طے کیا۔ حتی کہ وہ مقام آ گیا جہاں ان دونوں نے جدا ہونا تھا۔ جب راستے الگ الگ ہونے لگے تو دوسرے کا عصاء بھی روشن ہو گیا لہٰذا ہر ایک اپنے اپنے عصا کی روشنی سے اپنے اہل و عیال تک پہنچ گیا۔

صاحبِ شفاء اور زرقانیؒ نے اس موضوع کے تحت درج ذیل حدیث بھی نقل فرمائی ہے جس میں یہ ذکر آیا ہے کہ:

''حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ بن نعمان ایک اندھیری رات میں جب کہ بارش ہو رہی تھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کو کھجور کی ایک شاخ عطا فرمائی'' آگے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

و قال انطلق به فانه ليضئى لك من بين يديك عشرا فاذا دخلت بيتك فسترى سوادا فضه به حتى يخرج فانه الشيطان فانطلق فاضاء له العرجون حتى دخل بيته و وجد السواد فضربه حتى خرج

(الشفاء، ۱:۳۳۳)

اور فرمایا اس کو لے جاؤ۔ یہ تمہارے لئے دس ہاتھ آگے اور دس ہاتھ پیچھے روشنی کرے گی اور جب تم گھر میں داخل ہوگے تو ایک سانپ دیکھو گے اس کو اتنا مارنا کہ وہ نکل جائے کیونکہ وہ شیطان ہے۔ پھر حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ وہاں سے چلے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی شاخ ان کے لئے روشن ہوگئی۔ حتی کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔ اندر جاتے ہی انہوں نے سانپ کو پالیا اور اتنا مارا کہ وہ نکل گیا۔

اوپر درج کردہ روایات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سراجِ منیر ہونے کی صفت جس کی طرف قرآن حکیم کی مذکورہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی ذات سرتاپا نور ہے۔ آپ وہ آفتابِ رسالت ہیں جس کی ضیا پاشیوں نے دنیا بھر کے اندھیروں کو اجالوں میں بدل کر رکھ دیا۔

86 ذاتِ مصطفےٰ ﷺ: تمام کمالات وفضائلِ انبیاء کی جامع

اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء کرام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمائے ان پر حضور ﷺ کے افضل ہونے کی شہادت خود قرآن حکیم نے دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ

(البقرہ،۲:۲۵۳)

یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ان میں سے کسی سے اللہ نے (براہِ راست) کلام فرمایا اور کسی کو درجات میں (سب پر) فوقیت دی (یعنی حضور نبی اکرم ﷺ کو جملہ درجات میں سب پر بلندی عطا فرمائی)

اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ تمام انبیاء اور سل نبی اور رسول ہونے میں برابر ہیں، نبوت اور رسالت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے فضائل و کمالات اور مرتبوں میں ضرور فرق رکھا ہے۔ ایک کو دوسرے پر کسی نہ کسی لحاظ سے امتیاز بخشا گیا ہے۔ کسی کو ایک معجزہ عطا ہوا اور کسی کو دوسرا، کسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے براہ راست کلام کیا اور کوئی صاحب کتاب ٹھہرا، کہیں حسنِ یوسف علیہ السلام وجہِ امتیاز و شان ہوا اور کہیں دمِ عیسیٰ علیہ السلام اور عصائے موسیٰ علیہ السلام کو باعثِ فضیلت قرار دیا گیا۔

مگر تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ تمام فضیلتیں اور امتیازات جزوی ہیں اور حضور نبی اکرم ﷺ کو درجے و مرتبے میں تمام انبیاء اور رسولوں پر کلی فضیلت دی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر کمال اور فضیلت جو حضور ﷺ کو عطاء ہوئی وہ اپنے درجے اور رتبے کے اعتبار سے اس نبی اور رسول سے جس میں وہ پہلے موجود تھی بڑھ کر ہے اور درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی کے فیضان سے ہی تمام نبیوں اور رسولوں کے جملہ فضائل و مراتب وجود میں آئے اور اکتسابِ فیض کا سلسلہ عالم رنگ و بو کے ظہور سے پہلے عالمِ ارواح کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ کئی احادیث سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ امام قسطلانیؒ، ملا علی قاریؒ، امام نبہانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور علامہ انور شاہ کاشمیریؒ سمیت بہت سے ائمہ حدیث اور علماء کرام نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔

اس حوالے سے کہ آنحضور ﷺ تمام انبیائے کرام ﷺ پر مطلق اور کلی فضیلت رکھتے ہیں بے شمار احادیث کتابوں میں درج ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر صرف چند احادیث کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں تا کہ ہمارا مقصود واضح ہو جائے۔

ا۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک جماعت صحابہ کرامؓ کی آپ کی منتظر تھی، جب آپ ان کے قریب آئے تو آپ نے سنا ایک کہہ رہا تھا: ''تعجب ہے کہ اللہ تعالی نے اپنی مخلوق سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا''، دوسرے نے کہا کہ کیا یہ زیادہ عجیب بات نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ ایک اور نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور اس کی روح ہیں، ایک نے کہا کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو صفی اللہ بنایا۔ تب آپ ﷺ ان کے سامنے آئے اور بعد از سلام فرمایا:

''میں نے تمہاری باتیں اور کلماتِ تعجب سنے ہیں، یہ سب سچ ہے مگر یہ بھی جان لو کہ میں اللہ کا حبیب ہوں میں یہ فخر سے نہیں کہتا۔ روزِ قیامت حمدِ الٰہی کا جھنڈا میرے ہی

ہاتھ میں ہوگا یہ بھی فخر سے نہیں کہتا۔ میں پہلا شفاعت کرنے والا ہوں جس کی شفاعت قبول کی جائے گی، اس پر فخر نہیں اور میں پہلا شخص ہوں جو جنت کا دروازہ کھٹکٹائے گا اور اللہ تعالی میرے لئے جنت کا دروازہ کھولے گا اور مجھے داخل کرے گا اس حال میں کہ میرے ساتھ مسلمان فقراء کی ایک جماعت ہوگی۔ اس پر بھی فخر نہیں اور میں اولین وآخرین میں سب سے زیادہ بزرگی والا ہوں مجھے اس پر بھی فخر نہیں (جامع الترمذی)

۲۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو میں سب سے پہلے آؤں گا اور جب لوگ بارگاہِ خداوندی میں اکٹھے ہوں گے تو میں ہی ان کا پیشوا ہوں گا اور جب وہ خاموش ہوں گے تو میں ہی خطیب ہوں گا اور ان کو خوشخبری دینے والا ہوں گا، جب ان پر مایوسی طاری ہوگی اس دن بزرگی اور رحمت کی چابیاں میرے ہی ہاتھ میں ہوں گی اور میرے ہی ہاتھ میں حمدِ الٰہی کا جھنڈا ہوگا اور میں ہی اولادِ آدم علیہ السلام میں سب سے زیادہ بزرگ اور مکرم ہوں۔ میرے گرد ایک ہزار خدام طواف کر رہے ہوں گے اور وہ سفید انڈوں یا بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح لگ رہے ہوں گے۔ (جامع الترمذی)

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنتی لباس میں سے مجھے ایک جوڑا پہنایا جائے گا، پھر مجھے عرش کی دائیں جانب کھڑا کیا جائے گا، میرے سوا اس جگہ اور کوئی کھڑا نہ ہوگا۔ (الشفاء)

۴۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''دیگر انبیاء پر مجھے چھ چیزوں کے باعث فضیلت دی گئی ہے: (۱) میں جوامع الکلم سے نوازا گیا ہوں۔ (۲) رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔ (۳) میرے لئے اموالِ غنیمت حلال کئے گئے۔ (۴) میرے لئے ساری زمین پاک کر دی گئی اور اسے سجدہ گاہ بنا دیا گیا۔ (۵) میں

تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ (٦) میری آمد کے ساتھ انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ (صحیح مسلم)

۵۔ حضرت ابن وہبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''باری تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ اے حبیب اللہ جو چاہو مجھ سے مانگو، میں نے عرض کیا کہ اے رب مانگوں تو کیا مانگوں جبکہ تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم بنایا، حضرت نوح علیہ السلام کو برگزیدہ کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا فرمائی جو ان کے بعد کسی کو مرحمت نہ کی جائے گی'' ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

''اے حبیب میں نے جو تمہیں عطا کیا ہے وہ ان سب سے بہتر ہے۔ میں نے تمہیں کوثر عطا کیا اور تمہارے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا دیا جس کی منادی فضاؤں میں سنی جاتی ہے اور زمین کو تمہارے لئے اور تمہاری امت کے لئے پاک قرار دیا اور تمہاری خاطر تمہارے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ معاف کر دیئے اور تمہیں بخشش دلانے والا بنایا۔ اس سے قبل میں نے ایسا کسی کے ساتھ نہیں کیا اور تمہاری امت کے دلوں کو صحیفے بنا دیا۔ میں نے حقِ شفاعت کو صرف تمہارے لئے اٹھا رکھا اور کسی دوسرے نبی کو تمہارے سوا یہ حق نہیں دیا۔

87 حضور ﷺ اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہیں

قرآن حکیم نے پہلی امتوں کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کے عطا کئے جانے پر شکر بجالاتے تھے۔ اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ نعمتوں کے شکرانے کے طور پر جشن اور عید منانا خود انبیاء کی سنت ہے۔ جس پر قرآن کی آیات واضح طور پر گواہ ہیں۔ آج بھی اہلِ کتاب ''مائدہ'' جیسی عام نعمت کے ملنے والے دن کو بطورِ عید مناتے ہیں۔ اس سے کسی کے ذہن میں یہ شبہ وارد نہیں ہونا چاہیے کہ پھر تو یہ عمل غیر مسلموں کے مشابہ ہو گیا کہ جس طرح وہ نعمت کا شکر بجالاتے ہیں ہم بھی اسی طرح بجالائیں۔ نہیں ایسی بات نہیں بلکہ اس مثال سے مقصود صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ وہ یہ ''یوم عید'' اپنی سابقہ روایات کے مطابق مناتے چلے آرہے ہیں اور ان کے اس عمل کا ذکر خود قرآن نے بھی کیا ہے۔

جب پہلی امتوں کو معمولی سی نعمت ملنے پر شکر بجالانے کا حکم تھا اور وہ اس کی تعمیل مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتی تھی تو امتِ مسلمہ کی راہ میں کیا امر مانع ہے کہ وہ اپنے آقا و مولا ﷺ کی دنیا میں مبارک تشریف آوری کے دن اس عظیم ترین نعمت کا شکرانہ ادا نہ کرے۔ جب عام نعمتوں پر شکر کرنا واجب ہے تو اس سب سے بڑی نعمت کا شکریہ بجالانا تو بدرجۂ اولیٰ واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں کیا شک ہے کہ کائنات میں حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے بڑی اور کوئی نعمت نہیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ کائنات کو وجود ہی اس نعمت کے ذریعے سے ملا اور دنیا و آخرت کی نعمتیں حضور ﷺ کے تصدق سے عطا ہوئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بنی نوعِ انسان پر بے حدو بے حساب احسانات، لاتعداد انعامات اور مہربانیاں فرمائیں ہیں اور یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا، کیونکہ وہ رحیم و کریم ذات ہے۔ مگر اس نے اتنا کچھ عطا کرنے کے باوجود اپنی کسی نعمت کا احسان نہیں جتلایا، اس لئے کہ وہ اتنا سخی ہے کہ کوئی اسے مانے یا نہ مانے وہ سب کو اپنے کرم سے نوازتا ہے اور کسی پر اپنے احسانات نہیں جتلاتا۔

لیکن ایک نعمت عظمیٰ اس کی ایسی بھی تھی کہ جب اس نے اسے بنی نوع انسان کی طرف بھیجا تو اس کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ نعمتوں بھری اس کائنات میں صرف اسی نعمت کا احسان جتلایا اور اس کا اظہار بھی عام لوگوں پر نہیں مومنین پر کیا اور احسان جتلانے سے پہلے اس کا احساس بڑی تاکید کے ساتھ دلایا۔ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ.

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بڑا ہی احسان فرمایا کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔

(آل عمران، ۳:۱۶۴)

سبحان اللہ! کیا لطیف نکتہ ہے کہ اللہ رب العزت خود فرما رہا ہے کہ اہلِ ایمان پر یہ میرا بہت بڑا احسان، انعام اور لطف و کرم ہے کہ میں نے تمہاری ہی جانوں میں سے تمہارے لئے وہ ہستی پیدا فرما دی جو میری محبوب ہے اور وہ میں نے اس لئے تمہیں عطا کر دی کہ تمہاری بگڑی ہوئی تقدیریں بدل دے اور تمہیں ذلت و گمراہی کے گڑھے سے نکال کر عظمت و شرف انسانیت کی بلندیوں تک پہنچا دے۔ میرے کارخانۂ قدرت میں اس سے بڑی نعمت اور کوئی تھی ہی نہیں۔ جب میں نے وہی محبوب تمہیں دے دیا جس کی خاطر لوح و قلم اور اس کائنات کو وجود میں لایا گیا تو ضروری تھا کہ میں رب العالمین ہوتے ہوئے بھی اس عظیم ترین نعمت کا احسان جتلاؤں اور ایسا اس لئے کیا گیا کہ امتِ مسلمہ کہیں اسے عام سی

نعمت سمجھتے ہوئے اس کی ناشکری نہ کرے اور اس کی قدر و منزلت سے بے نیازی کا مظاہرہ نہ کرے۔ اس احسان جتلانے میں بھی امت کی بھلائی ہی کو پیشِ نظر رکھا گیا۔

قرآنِ حکیم نے اس واضح حکم کے ذریعے ہر مسلمان کو آگاہ کر دیا کہ خبردار اللہ کے اس عظیم احسان کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ یاد رکھو کہ اگر تم احسان فراموشی کرو گے تو اس سے اللہ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کو تو (نعوذ باللہ) کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی اس کی شان میں کوئی فرق پڑ سکتا ہے۔ اس لئے کہ تم اس احسان پر شکرانہ ادا کرو یا نہ کرو، حضور ﷺ کے ذکر کی ہر لمحہ بلندی کا وعدہ تو خدائے بزرگ و برتر نے ان الفاظ میں کر رکھا ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى. (الضحٰی، ۴:۹۳)	اور (اے محبوب) ہر آنے والی گھڑی تیرے لئے پہلی گھڑی سے بہتر ہے۔

اور اے محبوب! آپ کا ذکر مبارک ہر آن بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ارشادِ گرامی بھی خود خالقِ کائنات کا ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ. (الانشراح، ۴:۹۴)	اور (اے محبوب!) ہم نے تیری خاطر تیرا ذکر بلند کر دیا ہے۔

اب اگر کوئی حضور ﷺ کا ذکر کرے گا تو اس میں اس کا اپنا فائدہ ہے اور کوئی ان کی تشریف آوری پر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بطور شکرانہ خوشی منائے گا تو یہ بھی اس کے اپنے مفاد کی بات ہے۔ وہ ایسا کر کے کسی پر احسان کر رہا ہے اور نہ ہی کسی کا فائدہ بلکہ اپنا ہی توشۂ آخرت بنا رہا ہے۔

88 جشنِ میلاد کی شرعی حیثیت

قرآن حکیم کی آیات اور متعدد احادیث سے جشنِ عیدِ میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت اوراس کی اصل غرض وغایت کا پتہ چلتا ہےاور یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اوراس کا احسان عظیم تصور کرتے ہوئے اس کے حصول پر خوشی منانا اور تحدیثِ نعمت کے طور پر اس دن عید منانا مستحسن اور قابلِ تقلید عمل ہے۔ پھر یہ خوشی منانا تو سنتِ الٰہی اور خود حضور ﷺ کی اپنی سنت بھی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے معمولات سے بھی ثابت ہے اور سابقہ امتوں کے عمل سے بھی اس امر کی گواہی ملتی ہے۔ اب بھی اگر کوئی اس کے جواز اور عدم جواز پر بحثیں کرے اوراس کو ناجائز، حرام اور قابلِ مذمت کہے تو اسے ہٹ دھرمی اور لاعلمی کے سوا اور کیا کہا جائے؟

جس طرح شریعتِ مطہرہ نے بہت سے معاملات کے بنیادی تصورات اور اصول بیان کر دیئے لیکن ان کی تفصیل کا معاملہ بعد کے علماء اور فقہا پر چھوڑ دیا۔ امت کے علماءِ حق کی اکثریت جس امر پر متفق ہو جائے وہ حضور ﷺ کے اس مبارک قول کے مطابق بالکل درست اور قرآن وسنت کے تابع ہوتا ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

جس کام کو (اکثر) مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے ہاں بھی اچھا ہوتا ہے اور جس کو (اکثر) مسلمان برا خیال کریں وہ عنداللہ بھی برا اور ناجائز ہوتا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل، ۱:۳۷۹)

اسی طرح ابن ماجہ کی ایک حدیث اجماعِ امت کے حق میں شہادت دے رہی

ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

بیشک میری امت گمراہی پر ہرگز متفق نہیں ہوسکتی (بفرض محال) اگر تم کوئی اختلاف دیکھتے ہو تو تمہیں چاہئے کہ ایسی صورت میں سوادِ اعظم کی طرف رجوع کرو (امام جلال الدین سیوطیؒ نے یہاں سوادِ اعظم سے طبقۂ اہلِ سنت مراد لیا ہے اور یہی حدیث کا مدعا ہے۔ (حاشیہ سنن ابن ماجہ: ۲۹۲)

ہر نئی بات کو بدعت کہہ کر رد کر دینا غیر دانشمندانہ اور غیر حقیقت پسندانہ فعل ہوگا۔ اسلامی حکومت کے قیام کا مسئلہ لے لیجئے، اس کے لئے شریعت نے یہ تو ضروری قرار دیا کہ مسلمانوں کی نمائندہ حکومت ہونی چاہیے، لیکن اس کا انتخاب کس طرح ہو، حکومت کی تشکیل کس ڈھب پر کی جائے، اس کے ادارے کس طرح وجود میں آئیں پھر ان میں اختیارات کی تقسیم کس اسلوب پر ہو؟ ان تفصیلات کے متعلق بالعموم خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اسی طرح تعمیرِ مساجد کا مسئلہ زیرِ غور لائیں۔ حضور ﷺ کے ظاہری زمانۂ اقدس میں مسجد نبوی ﷺ کی شکل اور تھی۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں اس کی شکل و شباہت میں تبدیلیاں آتی رہیں؟

وجہ یہ تھی کہ اسلام کے شروع کے دور میں پختہ مکانات بنانا ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا، لہٰذا مسجد کو بھی از روئے شرع پختہ بنانا ناجائز تصور کیا جاتا رہا۔ پھر ایک وقت آیا جب اسلامی سلطنت کی حدیں شرق و غرب تک پھیل گئیں، تہذیب و ثقافت اور رہن سہن کے طریقوں میں تبدیلیاں آگئیں، لوگوں نے اپنی رہائش کے لئے بڑے بڑے، کشادہ اور پختہ مکانات بنانا شروع کر دیئے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے دورِ حکومت میں اور اس کے بعد مسلمانوں نے جب بلند و بالا محلات تعمیر کرنا شروع کر دیئے تو علماء نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اللہ کے گھروں کی تعمیر کو بھی اسی طرح نہ صرف جائز کہا بلکہ عظمتِ اسلام کے پیش

نظر ضروری قرار دیا۔ یہاں ایک ضروری ضمنی نکتے پر غور کرتے چلیں کہ دین کو اگر ظاہری لفظوں سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس سے (الا ماشاء اللہ) گمراہی کے سوا کچھ نہیں ملتا، لیکن اگر دین کی اصل روح اور اس میں پوشیدہ حکمتوں پر غور کر کے اس کے احکام کو پرکھا جائے تو نہ صرف دین کا فہم پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ ہدایت کا باعث بھی بنتا ہے۔

اب اگر مساجد کی اس تبدیلی پر غور کیا جائے تو اس کی مصلحت سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس وقت لوگوں کے اپنے گھر کچے ہوتے تھے لہٰذا اللہ کے گھر کا کچا ہونا کسی عار کا باعث نہ تھا لیکن جب لوگوں کے اپنے مکانات پختہ محلات میں بدل گئے تو خانۂ خدا کے جاہ وجلال اور ظاہری رعب و دبدبے کے پیشِ نظر پختہ اور خوبصورت مساجد کا فتویٰ دے دیا گیا۔

مندرجہ بالا صورتحال کے پیش نظر محافلِ میلاد اور جشنِ میلاد بھی صدیوں سے تنقید کا نشانہ بنے آرہے ہیں۔ مخالفین صرف اس لئے اس کو ناجائز اور (نعوذ باللہ) حرام قرار دیتے ہیں کہ اس قسم کی محافل اور جشن کی تقاریب اسلام کے دور اول میں منعقد نہیں ہوتی تھیں۔ لہٰذا ان کی نظر میں یہ بعد کی پیداوار اور سراسر بدعت ہے۔

لیکن اعتراض کرنے والوں کو یہ جان لینا چاہئے کہ جہاں تک جشنِ میلاد النبی ﷺ کا تعلق ہے، اسے صرف بدعت کہہ کر اس کو ناپسندیدہ کہہ دینا محض تنگ نظری اور ہٹ دھرمی ہے اور ایسا کہنے والے مسئلہ کی اصل روح سے بے خبر ہیں۔

اگر تاریخی پس منظر میں میلاد النبی ﷺ کی موجودہ صورتحال کو دیکھیں تو یہ اپنی اصل کے اعتبار سے بالکل حضور ﷺ کی اپنی سنت ہے۔ جس طرح ہم محفل میلاد میں حضور ﷺ کی نعت سنتے ہیں، آپ ﷺ کے فضائل و کمالات اور مختلف انداز میں سیرتِ طیبہ کے تذکرے ہوتے ہیں بالکل یہی ہمارے جشنِ میلاد کا مقصد ہے۔ اسی طرح کی محفلیں حضور ﷺ کے ظاہری زمانہ مبارک میں بھی منعقد ہوتی تھیں، آپ ﷺ محفل میں

بیٹھتے تھے اور اپنی محفلِ نعت منعقد کرواتے تھے۔ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کو فرماتے کہ حسان! ہم اپنی محفل میں نیچے بیٹھتے ہیں تو نعت سنا۔ چنانچہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں نعتیہ اشعار کہتے۔ حدیثِ صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے کہ یا اللہ جب تک حسان میری نعت پڑھتا رہے جبرائیل امین کو اس کی مدد کے لئے مقرر فرما دے۔

(صحیح بخاری،۲:۹۰۸)

چنانچہ جشن میلاد کے وقت نعت خوانی اور ذکرِ میلاد کے علاوہ جلوس بھی نکالا جاتا ہے جس کی اصل صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ مسلم شریف میں باب الہجرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے جانے کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے نقل کیا گیا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں آمد متوقع تھی اور ہر روز مدینہ منورہ کے لوگ (جو ایمان لا چکے تھے) مرد، عورت، بوڑھے، بچے سب جلوس کی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہتے یہاں تک کہ ایک دن جب سرکار دو عالم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شرفِ میزبانی بخشا تو اس دن ہر فرد خوشی سے مدینہ کی گلیوں میں نکل آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ میں آمد کا ایسا پر جوش جلوس دیکھنے میں آیا جس کا آج کے دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

89 درود وسلام کی فضیلت

درود وسلام کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو حکمِ خداوندی ہونے کے ساتھ ساتھ سنتِ الٰہیہ بھی ہے۔ حکم خداوندی ایک ایسی چیز ہے جس میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن اللہ کی سنت ہر زمانے میں ایک ہی حالت پر قائم رہتی ہے اور وقت بدلنے کے ساتھ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ قرآن حکیم نے اسے یوں بیان فرمایا ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلًاO (فاطر، ۴۳:۳۵)

اور تو ہرگز اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔

حکمِ الٰہی اور سنتِ الٰہی کا فرق معلوم کرنے کے لئے قرآن حکیم کی اس آیت پر غور کریں جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب، ۵۶:۳۳)

بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اے ایمان دارو! تم بھی ان پر صلوٰۃ پڑھو اور سلام بھیجو جیسا سلام بھیجنے کا حق ہے۔

تو پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہی نہیں سنت بھی ہے اور چونکہ یہ سنت ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

درود وصلوٰۃ کے اس حکم میں بڑی حکمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ عربی زبان میں فعل

مضارع، حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے لئے آتا ہے۔ زمانہ ماضی جو گزر گیا وہ اس کے دائرے سے باہر ہے جبکہ زمانہ حال اور مستقبل میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ فعل خواہ کسی شکل میں ہو اس کی نسبت کسی زمانے پر خاص نہیں ہوتی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمانہ ایک عارضی شئے ہے، مستقل نہیں کہ ہر فعل اس کے مفہوم اور معنی میں آ جائے۔ آیتِ درود میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ دیکھو میرا وہ فعل جو نبی اکرم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام سے متعلق ہے جب سے زمانہ بنا ہے اس وقت سے جاری ہے اور جب تک زمانہ رہے گا تب تک صلوٰۃ وسلام کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے میں اپنے فرشتوں کو اپنے ساتھ شریک کر رکھا ہے اور وہ صبح وشام اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر عبادت کا کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں کہ اس وقت کے علاوہ وہ عبادت کرے، لیکن درود کے معاملہ میں کوئی پابندی نہیں اور کوئی اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا اے بندو! تم بھی اللہ اور فرشتوں کی اس سنت کو دل وجان کے ساتھ جاری رکھو اور یہ عمل جتنا کثرت سے ہوگا اتنا ہی تمہارے لئے مفید ہوگا۔

صلوٰۃ اور سلام ایک ایسا محبوب اور مقبول عمل ہے جو کسی صورت اور کسی مرحلے پر رد نہیں ہوتا اور وہ ظنی القبول نہیں یعنی اس کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ شاید قبول ہو یا نہ ہو، بلکہ وہ قطعی القبول ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور قبول ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر پڑھنے والا شخص فاسق وفاجر اور گناہوں میں لت پت ہی کیوں نہ ہو پھر بھی جب وہ درود پڑھتا ہے قبول کر لیا جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ جب بندہ اللہ کی بارگاہ میں اس کے حبیب پر صلوٰۃ وسلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے بندے میں تو پہلے ہی

اپنے محبوب پر صلوٰۃ بھیج رہا ہوں، اس کے ذکر کو بلندی اور اپنا قربِ خاص عطا کر رہا ہوں۔ لیکن چونکہ تو نے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا اور اپنی کسی غرض کو بیچ میں نہیں ڈالا اور صرف میرے محبوب کے لئے صلوٰۃ وسلام اور درود بھیجنے کی درخواست کی ہے میں تیری درخواست اور دعا کو قبول کرتا ہوں۔

درود شریف کی فضیلت یہ ہے کہ وہ عبادتیں بھی جو ظنی القبول کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کے لئے وقت نکالنا اور خاص مشقت اٹھانا پڑتی ہے درود شریف کی برکت سے اللہ کی رحمت انہیں بے آسرا نہیں چھوڑتی بلکہ اپنے خاص لطف وکرم سے انہیں قطعی القبول بنا لیتی ہے۔اس لئے انسان کو بتا دیا گیا ہے کہ وہ ہر عمل اور عبادت کے شروع اور آخر میں درود و سلام پڑھ لے، جب اسے بارگاہِ خداوندی میں پیش کیا جائے گا تو اسے ضرور قبول کرلیا جائے گا۔

90 عشقِ مصطفےﷺ کی حقیقت (۱)

نبیِ اکرمﷺ سے محبت اور قلبی تعلق کی حقیقت کے بارے میں اہلِ علم حضرات کے مختلف اقوال ہیں۔ ہر شخص نے اپنی سوچ کے مطابق اپنا مفہوم بیان کیا ہے۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت سفیان ثوریؒ کا فرمان ہے کہ اتباعِ رسولﷺ کا نام محبت ہے انہوں نے اپنے دعوے کی دلیل قرآن مجید کی اس آیت کو ٹھہرایا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ"

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ حُبِّ رسولﷺ امتی کے اس اعتقاد کو کہتے ہیں جس کی رو سے وہ آپﷺ کی سنت کی پیروی کو اپنے لئے نہ صرف لازم جانے بلکہ سنت کے مخالفین کی مخالفت ہی نہیں بلکہ ان کو مٹانے میں دریغ نہ کرے۔ حُبِّ رسول اللہﷺ کا تقاضا ہے کہ ترکِ سنت کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔

اہلِ محبت میں سے بعض نے کہا کہ ذکرِ محبوب کے دوام کا نام محبت ہے جبکہ بعض کے نزدیک محبوب پر جاں نثار کرنا محبت ہے۔ یہ ساری باتیں محبت کی علامتوں کو بیان کرتی ہیں محبت کی حقیقت کو نہیں۔ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا دل اس طرف مائل ہو جو فطرت کے عین مطابق اور موافق ہو اور محبت کے سبب فطرتِ انسانی ان چیزوں کی طرف جن سے محبت ہو جائے خود بخود مائل ہونے لگے۔ اب رہی یہ بات کہ کسی سے محبت کیوں کی جاتی ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ محبوب نے محبت کرنے والے پر کوئی احسان کیا ہوتا ہے جس کی وجہ سے فطرتِ انسانی کے مطابق انسان اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو نبی اکرمﷺ کی ذات گرامی ان تمام

خوبیوں اور صفتوں کا مجموعہ ہے جو محبت کا سبب بنتی ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ کا امت پر اتنا عظیم احسان، کرم اور شفقت ہے کہ قرآن نے آپ کو مومنوں کے حق میں رؤف ورحیم قرار دیا۔ آپ ساری کائنات کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے۔ چنانچہ آپ سے بڑھ کر انسانیت کا محسن اور کون ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے لوگوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالا اور نجات کی راہ دکھائی، آپ کی ذات رب تک پہنچنے کا وسیلہ بنی اور انہیں، جو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، دوزخ کے عذاب سے رہائی دلائی۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے خالص محبت کا تقاضا اور محبت کی حقیقی پہچان یہ ہے کہ محبوب کی اداؤں سے بھی محبت کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر دعویٰ محبت کو درست تسلیم نہیں مانا جائے گا۔ قاضی عیاضؒ نے دل کو چھونے والے انداز سے محبت کے اس تقاضے کو بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

اعلم انّ من احب شيئا آثره و آثر موافقته والا لم يكن صادقا فی حبه و كان مدّعيا (الشفاء، ۲: ۱۹)	یہ بات ذہن نشین رہے کہ جو شخص جس سے محبت کرتا ہے وہ اس کو اس ذات کی موافقت اور اس کے اتباع کو اپنی ذات پر لازم کر لیتا ہے۔ بصورتِ دیگر وہ اپنے دعویٰ محبت میں صادق نہیں ہوتا۔

آپ مزید لکھتے ہیں کہ اگر آپ ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرنے والا آپ کا اتباع نہیں کرتا تو وہ محبت کے دعوے میں جھوٹا ہوگا۔

فالصادق فی حب النبی ﷺ من تظهر علامة ذالك عليه و اولها الاقتداء به و استعمال سنته و	نبی کریم ﷺ کی محبت میں سچا ہونے کی بعض علامات ہیں۔ ان میں سب سے پہلے یہ کہ حضور علیہ السلام کی پیروی کی

اتباع اقواله و افعاله و امتثال اوامره و اجتناب نو اهیه و التادب بآدابه فی عسرةِ و یسرةِ و منشطه و مکرهه و شاهد هذا قوله تعالی ''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ

(الشفاء۲:۱۹)

جائے۔اور سنت نبوی ﷺ پر عمل کیا جائے۔تمام اقوال و افعال میں حضور علیہ السلام کی اتباع کرے اور آپ ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل کرے،جن افعال پر عمل کرنے کی حضور ﷺ نے ممانعت فرمائی ان سے پرہیز کرے۔عیش و آرام اور عسرت و پریشانی میں ہی نہیں بلکہ ہر حال میں حضور علیہ السلام کے طرزِ عمل سے نصیحت و موعظت حاصل کرے۔اس سلسلہ میں یہ آیت کریمہ شاہد ہے۔جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اے محبوب آپ (ﷺ) ان سے فرمادیں کہ اگر محبتِ الٰہی کا دعویٰ کرتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ،اللہ تمہیں اپنا دوست بنا لے گا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے'' محبت کا دعویٰ کرنا اور محبوب کی نافرمانی کرنا عجیب بات ہے اگر تیری محبت صادق ہوتی تو تُو اس کی اطاعت کرتا''۔

91 عشقِ مصطفے ﷺ کی حقیقت (۲)

دنیا کا عام اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پر ایک یا دو مرتبہ احسان کرتا ہے تو وہ اس کے گن گانے لگتا ہے، کسی کو ہلاکت یا نقصان سے محفوظ کرتا ہے تو وہ اس کا شکر گزار ہوتا ہے حالانکہ یہ نقصان عارضی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ذات کریم جن کے احسان ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اس کی تو بات ہی کچھ اور ہے انہوں نے امت کو جس ہلاکت سے محفوظ فرمایا وہ دائمی ہلاکت یعنی دوزخ کے عذاب سے متعلق ہے۔ لہٰذا سرکارِ دو عالم ﷺ ہی انسانیت کے محسن ہیں۔ آپ نے بنی نوعِ انسان کو تمام مصیبتوں اور دنیا آخرت کے آلام سے نجات دلا کر ابدی سکون اور اطمینان دیا۔ آپ ﷺ میں وہ سارے اوصاف اور خصلتیں موجود ہیں تو پھر آپ کیونکر محبت کے لائق نہ ہوں گے۔ اسی لئے قرآن نے حضور ﷺ کی محبت کو دین اور ایمان کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ

(التوبہ، ۹: ۲۴)

(اے رسول آپ ان لوگوں سے) فرما دیجئے! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں ارتمہارے خاندان کے لوگ (معاشرے والے) اور وہ مال جو تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تم کو خوف ہے اور وہ مکانات جو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں۔ تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے اور خوب سمجھ لو کہ اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت کے آخری الفاظ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ خدا اور رسول ﷺ سے محبت کے بغیر ایمان و اسلام کے دعوے کرنے والوں کو اللہ کی بارگاہ سے ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو اس ہدایت سے محروم ہوتے ہیں بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود فاسق اور گمراہ ہیں۔ حضور ﷺ نے کئی مرتبہ اپنے صحابہ کو اس بارے میں آگاہ فرمایا تا کہ امتِ مسلمہ ایمان کی حقیقت تک پہنچنے میں کسی شک وشبہ میں نہ پڑے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ثلاث من کن فیه و جد حلاوة الایمان ان یکون الله و رسوله احب الیه مما سواھما و ان یحب المراء لا یحبه الا لله و ان یکرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار ۔	جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں گی وہ حلاوتِ ایمان سے لطف اندوز ہوگا۔ (۱) اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوں۔ (۲) اگر کسی سے محبت ہو تو صرف اللہ کے لئے ہو۔ (۳) اور کفر پر رجوع ہونے کو اسی طرح ناپسند جانے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو جانتا ہے۔
(صحیح البخاری، ۱:۷، کتاب الایمان، رقم حدیث:۱۶)	

حضرت ابوھریرةؓ اور حضرت انسؓ سے ایک روایت جس کے الفاظ ملتے جلتے ہیں اس طرح ہے:

قال رسول الله ﷺ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه من والدہ وولدہ والناس اجمعین	کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کو اس کے ماں باپ اولاد اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔
(صحیح البخاری، ۱:۷، کتاب الایمان، رقم حدیث:۱۵)	

اس طرح ایک بار حضور ﷺ سے حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا کہ مجھے آپ میری جان کے علاوہ ہر چیز سے محبوب ہیں تو آپ ﷺ نے انہیں ایمان کا معیار بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کوئی اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کے دل میں میری محبت اپنی جان سے بھی زیادہ نہ ہو۔ روایت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

لانت احب الیّ من کل شیئ الا نفسی التی بین جنبی فقال له النبی لن یومن احدکم حتی اکون احب الیه من نفسه فقال عمر' والذی أنزل علیك الکتاب لانت احب الیّ من نفسی التی بین جنبی فقال له النبی ﷺ الان یا عمر۔

(الشفاء ۲:۱۵)

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا) میرے دونوں پہلوؤں کے درمیان جو میری جان پوشیدہ ہے اس کے علاوہ آپ ﷺ مجھے سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں''۔ یہ ارشاد سن کر حضرت عمر فاروق ؓ نے عرض کیا اگر ایسا ہے تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ ﷺ کو حق و صداقت کے ساتھ کتاب ہدایت دے کر مبعوث فرمایا آپ ﷺ مجھے میری اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا اے عمر اب تمہارا ایمان مکمل ہوا ہے۔

92 حیاتِ نبوی ﷺ کا معاشرتی پہلو

معاشرہ اور سماج زندگی کا اجتماعی روپ ہیں۔ حضور ﷺ کی معاشرتی زندگی ایثار و بے نفسی اور فیض رسانی کا اس قدر مکمل نمونہ تھی کہ اس کی اور کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے معاشرے سے غربت، افلاس، فقر و فاقہ اور معاشی تعطل ختم کرنے کے لئے اپنی ساری کی ساری دولت لٹا دی۔ آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل کا پتہ آپ کے اس ارشاد سے ملتا ہے جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یوں روایت کیا ہے۔

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو مجھے اس بات پر دلی خوشی ہوگی کہ تین راتیں گزرنے سے پہلے اس میں سے کچھ نہ بچے سوائے اس کے جس سے میں قرض ادا کرسکوں۔'' (صحیح بخاری)

یہ حضور ﷺ کی زندگی مبارکہ کا وہ اصول تھا جس پر آپ ﷺ عمر بھر عمل پیرا رہے اور یہ ہر دور کے لئے ایک نمونۂ کمال ہے۔ معاشرتی زندگی میں ان لوگوں کو فراخیاں اور آسانیاں فراہم کرنا جو بنیادی معاشی ضرورتوں سے محروم ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ حکیم نے اہلِ ایمان کو انفاق و ایثار کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ. (البقرہ،۲:۲۱۹)	آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں۔ فرما دیجئے ۔ جو کچھ تمہاری ضرورتوں سے زائد ہے دوسروں کے لئے خرچ کردو۔

اس حکم پر کس طرح عمل ہوا اس کی تفصیل جو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو

بیان فرمائی اسے ابوسعید حذریؓ نے یوں روایت کیا ہے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سفر کے دوران حضور ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ ''تم میں سے جس کے پاس ضرورت سے زائد کپڑا ہو وہ اس شخص کو لوٹا دے جسے اس کی ضرورت ہے اور جس کے پاس ضرورت سے زائد کھانا ہو وہ اس شخص کو لوٹا دے جسے اس کی ضرورت ہے (حضرت ابوسعید حذریؓ فرماتے ہیں) حتیٰ کہ ہم نے یہ سمجھا کہ ضرورت سے زائد کسی چیز پر بھی ہمارا حق نہیں۔(ابوداؤد)

اس ارشادِ نبوی ﷺ نے ایک ایسے نمونۂ عمل کی بنیاد فراہم کر دی جو صحیح فلاحی اسلامی معاشرے کے قیام کا ضامن ہے۔صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم ایسے معاشرتی حالات میں دیا گیا تھا جب معاشی ناہمواریاں تھیں اور کچھ لوگ ایسے تھے جن کے پاس ضرورت سے زائد سامان بچ رہتا تھا جبکہ دوسرے لوگ ان بنیادی ضرورتوں سے محروم تھے۔ یہ صورتِ حال آنحضور ﷺ کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس حدیث مبارکہ میں ''فلیعدبہ'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں جو روایت میں دو مرتبہ آئے ہیں اور جس میں لوٹا دینے کا حکم صادر فرمایا گیا ہے۔یہ نہیں کہا کہ ضرورت مند کو دے دو۔لوٹایا تو اس چیز کو جاتا ہے جو اسی طرف سے آئی ہو اور اگر اس طرف سے نہ آئی ہو تو ''لوٹانے'' کا نہیں ''دینے'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔یہ فرما کر حضور ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہ کو اس امر کی تعلیم دے رہے تھے کہ جب معاشرے میں اس قدر ناہمواریاں پائی جائیں تو یہ جان لینا چاہیے کہ جو کچھ کسی شخص کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ ہے وہ یقیناً کسی نہ کسی کا حق تھا جو اس سے چھین لیا گیا ہے۔حق تلفی کا یہ عمل خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ کسی ضرورت مند کا حق تھا اور اگر وہ اسے دے دیا جاتا تو کسی کے پاس کچھ زائد نہ بچتا۔حضور ﷺ کے فرمان میں ''فلیعدبہ'' کا جو مفہوم ہے قرآن مجید نے اس کے تصور کو یوں واضح فرمایا ہے۔

وَفِیٓ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِلسَّآئِلِ اور ان دولت مندوں کے اموال میں

وَالْمَحْرُوْم.　　　　سائلین ومحرومین کا حق بھی شامل ہے۔

(المعارج،۷۰:۲۴)

اس آیتِ کریمہ نے یہ حقیقت کھول کر بیان کردی ہے کہ کسی کا حق ہوتا ہی اس لئے ہے کہ اسے ادا کیا جائے اور اگر اس کی ادائیگی کو روک دیا جائے تو وہ سراسر ظلم ہوگا اور وہ دولت جس میں ظلم کی آمیزش ہو جائز نہیں ہوسکتی۔ اس لئے قرآن مجید نے ایسا منصفانہ معاشی نظام قائم کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ جس میں کسی ظلم وزیادتی اور حق تلفی کی گنجائش نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔　　　　یہ مال و دولت تم میں سے صرف امراء کے ہاتھوں میں ہی گردش نہ کرتی ہے۔

(الحشر،۷)

چنانچہ یہ بات قطعی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ارشاد کی روح کو سمجھ چکے تھے اور انہوں نے جان لیا تھا کہ ضرورت سے زائد اناج کے ایک دانے پر بھی ان کا حق نہیں۔ اس بات کی توضیح ایک اور ارشاد میں آپ نے فرمادی جسے صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں یوں بیان کیا گیا۔

''اے بنی آدم اگر تو اپنی ضرورت سے بچا ہوا مستحقین پر خرچ کردے تو یہ تیرے لئے بہتر ہے اور اگر تو اسے بچا کر رکھے تو یہ تیرے لئے نقصان دہ ہے۔ اپنی ضرورت کے لئے بچا رکھنے پر کوئی ملامت نہیں......

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معاشرتی زندگی میں جو نمونۂ کمال عالمِ انسانیت کے سامنے رکھا وہ یہ تھا کہ ''اگر کوئی شخص صبح اس حال میں کرے کہ اس کے پیٹ میں ضرورت کی غذا ہو اور وہ اس کے ہوتے ہوئے دن کا کھانا سنبھال کر رکھے تو وہ یہ سمجھے کہ اس نے دنیا جمع کر رکھی ہے۔ (صحیح بخاری)

93 حیاتِ نبوی ﷺ کا سیاسی پہلو

حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ قیامت تک کے ہر دور کے لئے مشعلِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انسانیت کے لئے مکمل رہنمائی کا سامان موجود ہے انسانی زندگی کی خواہ نجی اور انفرادی سطح ہو یا عائلی، خاندانی، اجتماعی قومی یا بین الاقوامی سطح ہر ہر سطح پر آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہر دور کے انسانوں کے لئے مکمل نمونۂ عمل ہے۔ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی اسی شان کو بیان کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہترین نمونۂ عمل ہے۔

(الاحزاب، ۳۳:۲۱)

انسانی زندگی کے عمل کا معیار سیرت و کردار کے اسی نمونہ سے اپنے کمال کو پہنچتا ہے جو حضور ﷺ کی اتباع اور پیروی کی صورت میں آئینے کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ جو شخص اپنی سیرت و کردار، رفتار و گفتار کو جس قدر اسوۂ مصطفوی ﷺ سے قریب کرتا چلا جاتا ہے اسی قدر وہ با کمال ہوتا چلا جاتا ہے۔

آقائے دو جہاں ﷺ نے فریضۂ نبوت کی ادائیگی کا ہر سطح پر اور ہر اعتبار سے حق ادا کر دیا۔ آپ نے کبھی قریشِ مکہ کو گلی کوچوں میں جا کر دعوتِ دی اور کبھی طائف کے بازاروں میں شر پسندوں کے پتھر کھا کر دعوتِ انقلاب کا فرض ادا کیا اور کبھی یہ کام منیٰ کے میلوں، دارِ ارقم کی چار دیواری اور کعبۃ اللہ کی دیواروں کے سائے میں کمال جرات و

شجاعت سے سرانجام دیا۔ آپ ﷺ دعوتِ انقلاب کو ایک ایک فرد تک پہنچانے کے لئے قریہ قریہ بستی بستی گئے‘ دور دراز علاقوں کے دورے کئے اور اپنے صحابہ کو بھی روانہ کیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک ابھی تقریباً ۳۵ برس تھی کہ آپ کی طرف سے سیاسی حکمت و بصیرت کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ یہ خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے بعد حجرِ اسود کی تنصیب کا مسئلہ تھا جس پر مختلف قبائلی سرداروں کے درمیان جھگڑا پیدا ہوگیا، ہر کوئی چاہتا تھا کہ یہ سعادت اس کے حصے میں آئے۔ معاملہ طول پکڑ گیا اور قریب تھا کہ تلواریں میانوں سے باہر نکل آتیں اور خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ لیکن کسی صلح کن شخص کی مداخلت سے یہ نوبت نہ آئی اور طے پایا کہ اگلی صبح جو شخص سب سے پہلے حرمِ کعبہ میں داخل ہو وہی حجر اسود اٹھا کر کعبہ کی دیوار میں رکھ دے۔

حسنِ اتفاق سے اگلے روز کعبہ میں داخل ہونے والے پہلے شخص حضور ﷺ تھے۔ آپ چاہتے تو حجرِ اسود خود دیوارِ کعبہ میں نصب فرما دیتے اور اس عمل سے قتل وخوں ریزی کا معاملہ وقت طور پر ٹل جاتا، لیکن آپ ﷺ کی نگاہِ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ قبائلی عصبیت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں کجی بدستور موجود رہے گی اور نفرتیں اور کدورتیں پلتی رہیں گی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے کمال حکمت اور دانشمندی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے قبیلوں کے تمام سرداروں کو طلب کیا اور ایک بہت بڑی چادر کے اوپر حجرِ اسود رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ وہ اس کے کونے تھام کر کعبہ کی اس دیوار کے پاس لے جائیں جہاں حجر اسود رکھنا مقصود تھا۔ جب چادر دیوارِ کعبہ کے قریب پہنچی تو آپ ﷺ نے پتھر اٹھا کر مطلوبہ جگہ پر رکھ دیا۔ آپ کی اس سیاسی حکمتِ عملی سے وہ جھگڑا ختم ہوگیا اور یوں طویل عرصہ تک جاری رہنے والے اس فتنے کا سدِ باب ہوگیا جس کے نتیجے میں قتل وغارت کا بازار گرم ہوسکتا تھا۔

چنانچہ بعثت کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ کا سینہ مبارک حکمت کے نور سے بھر دیا

گیا اور وحی کی صورت میں علمِ نبوت عطا ہونا شروع ہوا تو آپ ﷺ کا قلبِ اطہر جو پہلے ہی بصیرت و فراست کا نمونہ تھا نورٌ علیٰ نور ہو گیا۔ حق بھی یہی ہے کہ انسان کے پاس حکمت کا نور ہو تو قرآن نفع دیتا ہے اور اگر اس کا سینہ اس نور سے خالی ہو تو قرآنی علم بھی نفع نہیں دیتا بلکہ وہ گمراہی کا سبب بن ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًاO (البقرہ،۲:۲۶)	اسی کے ذریعے وہ کثرت سے لوگوں کو گمراہ بھی کرتا ہے اور کثرت سے ہدایت بھی عطا فرماتا ہے۔

یاد رہے کہ پیغمبرانہ دعوت و تبلیغ کے لئے سیاسی حکمتِ عملی کا ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کے ضمن میں آپ ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ۔ (النحل،۱۶:۱۲۵)	اپنے رب کے راستے کی طرف (بندوں کو) حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ بلائیے اور (اس جدوجہد میں اگر جھگڑے تک بھی نوبت پہنچ جائے تو) جھگڑا بھی نہایت احسن انداز میں کیجئے۔

دعوتِ دین کے سلسلے میں تین بنیادی چیزوں (۱) حکمت و بصیرت (۲) موعظتِ حسنہ (اچھی نصیحت) اور اس جدالِ احسن (جھگڑے میں حسن) کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جب آپ ﷺ دینِ حق کی انقلابی دعوت کو لے کر چلے تو آپ اور آپ کے ماننے والوں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے، انہیں مشقِ ستم بنایا گیا اور آپ ﷺ کی زندگی کے چراغ کو گل کرنے کے لئے کیا کیا سازشیں نہ ہوئیں مگر آپ نے اپنا سفر کمال سیاسی حکمت اور بصیرت سے جاری رکھا۔ اپنے

جان نثاروں کی سیاسی تربیت کی یہاں تک کہ یثرب کی سرزمین جسے بعد میں مدینہ بننے کا شرف حاصل ہوا دعوتِ دین کے کام کے لئے ہموار ہوگئی اور ہجرتِ مدینہ کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد نے خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہجرتِ مدینہ کا فیصلہ کوئی ہنگامی فیصلہ نہیں بلکہ ایک باقاعدہ سیاسی حکمتِ عملی کا حصہ تھا۔ اس حکمتِ عملی سے ایک نئی قومیت کی بنیاد رکھی گئی اور ایک نیا تصورِ ملت حقیقت کا روپ دھار گیا اور سرزمینِ مدینہ میں باقاعدہ سیاسی وانقلابی جدوجہد کا آغاز کر دیا گیا۔

94 معجزۂ معراجِ مصطفیٰ ﷺ (۱)

نبیٔ آخرالزماں ﷺ کے معجزات میں معجزۂ معراج خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو اللہ رب العزت نے اپنے برگزیدہ رسولوں اور نبیوں کو اپنے خصوصی معجزوں سے نوازا، ہر نبی کو اپنے زمانے، علاقے اور حالات کے مطابق معجزات عطا ہوتے رہے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ انہیں دیکھ کر لوگوں پر نبی کی صداقت اور حقانیت آشکار ہو جائے اور وہ دولتِ ایمان سے سرفراز ہو جائیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت جادو میں کمال رکھتی تھی تو اس کا توڑ کرنے کے لئے اللہ نے اپنے نبی کو معجزات عطا کئے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں علمِ طب کا بہت چرچا تھا، چنانچہ وہ معجزاتی طور پر کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے اور مردوں کو بھی زندہ کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

جب حضور اکرم ﷺ کی نبوت ورسالت کا زمانہ آیا اور آپ ﷺ کے سرِ اقدس پر ختمِ نبوت کا تاج سجایا گیا تو آپ ﷺ کو ایسے معجزات سے نوازا گیا جن کا مقابلہ تمام قومیں علمی اور سائنسی ترقی کے باوجود بھی نہیں کر سکتی تھیں، اللہ رب العزت کو معلوم تھا کہ امتِ محمدی ﷺ کے زمانے میں انسان چاند پر قدم رکھے گا اور دوسرے ستاروں پر بھی کمندیں ڈالی جائیں گی۔

لہٰذا حضور ﷺ کو ایک ایسا معجزہ عطا کیا گیا جو کسی انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا اور جس کی بدولت آپ ﷺ مکان ولامکاں کی وسعتوں کو طے کر کے مقامِ قاب وقوسین تک پہنچے اور حسنِ مطلق کا بے نقاب جلوہ کیا، انبیائے کرام سے ملاقاتیں کیں

اور جب اس سفر سے واپس لوٹے تو گھر کے دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی اور وضو کا پانی حرکت میں تھا۔ عقلِ ابوجہل و بولہب اس واقعہ کو نہ مانی کہ تشکیک کے غبار نے حقیقت کو پردے میں چھپا لیا تھا جبکہ عشقِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حقیقت بے نقاب ہوگئی تھی اور یوں بشریت کے ارتقاء کا سفر اپنے معراج کو پہنچا اور یہ سفر جو پروازِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کی انتہا کا نام ہے عظیم ترین معجزے کی صورت میں ایک شاہکار کے طور پر ظہور پزیر ہوا۔

سفرِ معراج بیداری کے عالم میں طے ہوا۔ آج کے سائنسی دور میں جبکہ انسان زمین و آسماں کی حدیں پھلانگنے لگا ہے اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں نے رات خواب میں آسمانوں کی سیر کی اور جب میں واپس آیا تو میرا بستر گرم تھا اور دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی تو اسے خواب کا واقعہ سمجھ کر کون ایسا ہے جو انکار کرے گا کہ خواب میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ اگر ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ خواب کے حوالے سے کرتے تو ابوجہل اور ابولہب کو اس سے انکار کی مجال نہ ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چونکہ یہ دعویٰ عالمِ بیداری کی نسبت کیا گیا تھا اس لئے مادیت کی پرستار عقلِ عیار اسے تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوئی۔ چونکہ جاگتے میں ایسا ہونا انسانی عقل سے بالاتر تھا۔ لہٰذا اس معجزے کو اہلِ ایمان کے لئے آزمائش قرار دیا گیا۔ قرآن مجید میں اس بارے میں ارشاد ہوا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا.

(بنی اسرائیل، ۱۷:۱)

(کہ ہر نقص، عیب اور ناممکن کے لفظ سے) پاک ہے وہ قادرِ مطلق جو لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت سیر کرانے۔

بعض لوگ یہ سمجھے کہ رویاء چونکہ عام طور پر خواب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ معراج خواب میں ہوا۔ یہ مفہوم غلط ہے کیونکہ عربی زبان میں رویاء

رات کے وقت کھلی آنکھوں سے دیکھنے کو بھی کہتے ہیں۔اس آیت میں رویاء سے مرادحسنِ مطلق کا مشاہدہ ہے۔جیسا کہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا:

لِنُرِيَهُ مِنۡ اٰيٰتِنَا تا کہ ہم اس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔ (بنی اسرائیل، ۱:۱۷)

معجزۂ معراج چونکہ کسی بھی بشر کے لئے عملاً ایک ناممکن بات تھی۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قدرتوں کا مظہر قرار دیتے ہوئے سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں اس پر اٹھنے والے انسانی عقل کے پیدا کردہ اعتراضات کو مسترد کر دیا کہ معراج اللہ تعالی کی قدرتِ کاملہ کا مظہر ہے۔اس پر کفار و مشرکین کا ردِعمل بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ معجزۂ معراج کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ کوئی خواب بیان ہو رہا تھا، کیونکہ اگر یہ کوئی خواب ہوتا تو وہ اس سے انکار نہ کرتے اور قرآن میں اس کا ذکر اس اہتمام سے نہ ہوتا۔

95 معجزۂ معراجِ مصطفیٰ ﷺ (۲)

سفرِ معراج تین مرحلوں پر مشتمل ہے:

پہلا مرحلہ مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک کا زمینی سفر ہے۔ یہ چونکہ دنیائے انسانیت کا حصہ ہے جس کی سوجھ بوجھ ذہن انسانی میں نسبتاً آسانی سے ممکن ہے، اس لئے اسے قرآن حکیم میں تفصیل سے بیان کیا گیا۔ اس مرحلۂ سفر کے واقعات اور احوال کو تفصیل سے سامنے لایا گیا ہے۔

سفرِ معراج کا دوسرا مرحلہ مسجدِ اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک کرۂ ارضی کے اس پار عالم ملکوت و جبروت کا نورانی سفر تھا۔ یہ چونکہ عالمِ خلق کی حدود کے اندر تھا، اسے بھی بیان تو کیا گیا مگر تفصیل اس لئے نہیں دی گئی کہ یہ واقعہ پوری طرح انسانی عقل و ذہن میں آنے والا نہ تھا۔

تیسرا مرحلہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے قاب قوسین اور اس سے بھی آگے تک کا ہے۔ چونکہ یہ سفر محبتوں اور قربتوں کا سفر تھا اور اس میں محبّ اور محبوب کی ملاقاتِ خاص ہوئی لہٰذا محبت کی اس روداد کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ سورۃ النجم میں راز و نیاز کی باتوں کے تذکرے فقط اشاروں کنایوں میں کئے گئے اور کوئی کیا جانے کہ کیا کیا باتیں ہوئیں؟ اس مقام پر **هو السميع البصير** کہہ کر بات ختم کر دی گئی۔ یہ نہیں بتایا کہ دیکھنے اور سننے والا کون ہے؟ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بھی ہو سکتی ہے اور آقائے دو جہاں ﷺ کی ذات بھی، اس کے دو معانی ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ اس مقامِ قرب پر فقط اللہ ہی اللہ تھا، جو پیار بھرے انوار سے اپنے محبوب کو تک رہا تھا، اور اس کی میٹھی میٹھی رس بھری زبان سے اس کی محبوبانہ گفتگو سننے میں محو تھا۔

۲۔ دوسرا معنٰی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس مقام پر فقط حضور ﷺ ہی تھے جو اپنے رب تعالیٰ کے حسین بے نقاب جلوے دیکھنے اور اس کے پیار بھرے ارشادات سننے میں مشغول تھے۔

یہ وہ مقام تھا جہاں محبتوں اور عظمتوں کا سفر اپنے مقصود کو پانے والا تھا، جس کا مخلوق سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اس داستانِ محبت کو بیان کرنے کے لئے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ محبّ و محبوب آمنے سامنے تھے، کبھی وہ سننے والا اور یہ سنانے والا تھا اور کبھی یہ دیکھنے والا اور وہ دیکھا جانے والا تھا۔

امام صاویؒ نے یہ معنٰی مراد لیتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے محبوب کی مدح بیان ہوتا کہ مخلوق پر واضح ہو جائے کہ آپ ﷺ کا مقام کتنا بلند ہے۔

سفرِ محبت کے اس مرحلے میں دو کمانوں کا استعارہ بھی اپنے اندر کمال بلاغت اور معنوی حسن رکھتا ہے۔ محبت اپنی زبان خود تخلیق کرتی ہے اور بعض اوقات اظہارِ محبت کے لئے کوئی لفظ بھی درکار نہیں ہوتا۔ بے تاب آنکھیں سارا حال خود کہہ دیتی ہیں۔ محبت کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تعلق کی گہرائی اور قرب کا اظہار اور دو چیزوں کا ذکر اس طرح کیا جائے جیسے ایک ہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہانتک کہ دوئی اور غیریت کا تصور تک مٹ جائے۔ اب رہی یہ بات کہ اللہ کس قدر قریب ہوا تو اس کا جواب اس آیت کے ذریعے دیا گیا۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ اَدْنٰى　　　　پھر دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم رہ گیا (جس کی کوئی حد معلوم نہیں)　　(النجم، ۵۳:۸)

اس تمثیل کا ایک ثقافتی پس منظر ہے۔ عربوں کے قبائلی رسم و رواج کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جب دو قبیلے آپس میں ملتے تو فریقین اپنی کمانوں کو آپس میں بدلتے اور پھر ملا کر تیر پھینکتے تو یہ تصور کیا جاتا کہ ایک کا پھینکا ہوا تیر دوسرے کا پھینکا ہوا تیر ہے۔ گویا یہ دو فریقوں کی آپس میں دوستی کی علامت اور اس بات کا اظہار تھا کہ ایک کی دشمنی دوسرے کی دشمنی ہے۔ قاب قوسین کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ وہ جو اللہ سے تعلق جوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اس کے محبوب کے دامنِ رحمت سے لپٹ جائے اور وہ جو محبوب ﷺ سے دشمنی رکھنے پر تلا ہوا ہے یہ جان لے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا دشمن بنا رہا ہے اور اس کے لئے دنیا اور عقبیٰ میں کہیں کوئی جائے اماں نہیں۔

96 معجزۂ معراجِ مصطفیٰ ﷺ (۳)

رسولِ آخر و اعظم ﷺ کے معجزات میں معجزۂ معراج انفرادی اہمیت رکھتا ہے۔

جب ہم تاریخِ انبیاء پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور نبیوں کو خصوصی معجزات سے نوازا، ہر نبی کو اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر معجزے عطا ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں پر ان کی عظمت اور صداقت آشکار ہو جائے اور وہ ایمان کی دولت سے سرفراز ہو جائیں۔ اس کی ایک مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دی جا سکتی ہے، جن کے زمانے میں لوگ جادو میں کمال رکھتے تھے۔ ہزاروں جادوگر فرعون کے دربار سے وابستہ تھے۔ چنانچہ اس کا توڑ کرنے کے لئے انہیں عصائے موسویؑ عطا کیا گیا جس نے اژدہا بن کر جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو نگل لیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب اپنے عروج پر تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کے اعجاز مسیحائی نے کمال دکھایا اور وہ مُردے زندہ کر دینے کی قدرت سے بھی فیضاب ہوئے اور وہ اپنے دم سے کوڑھیوں کو بھی تندرست کر دیتے تھے۔

اب جیسا کہ پہلے بیان ہوا جب نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کا زمانہ آیا تو ان کے سرِ اقدس پر ختمِ نبوت کا تاج سجایا گیا۔ چونکہ ان کے بعد آنے والے زمانوں میں سائنسی ترقی اپنے عروج پر پہنچنے والی تھی اور اللہ رب العزت کے علم میں تھا کہ انسان ستاروں پر بھی کمندیں ڈالنے لگیں گے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو ایسا معجزہ عطا فرما دیا، جس سے مکان ولامکاں کی وسعتیں اور بلندیاں ان کی عرش گیر پرواز سے نیچے رہ

جائیں گی۔ معجزۂ معراج ایسا معجزہ ہے کہ تمام معجزات مل کر اس کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ حضور ﷺ کا وہ دائمی معجزہ ہے۔ جس کی عظمت میں سائنس کے نئے کائناتی حقائق منکشف ہونے کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا جائے گا اور ارتقاء کے سفر کی طرف اٹھنے والا ہر قدم معجزۂ معراج کی صداقت کی گواہی دے گا۔ سفرِ معراج میں وقت سرورِ کائنات ﷺ کی مٹھی میں آ گیا تھا۔ آپ براق پر سوار ہو کر مکہ سے اٹھے، بیت المقدس پہنچے، وہاں سے آسمانوں سے ہوتے ہوئے عرشِ معلےٰ تک گئے اور لامکاں کی تمام وسعتوں کو طے کرتے ہوئے مقامِ قابِ قوسین پر حسنِ مطلق کے بے نقاب جلوؤں سے سرفراز ہوئے، انبیائے کرام سے ملاقاتیں کیں اور بے شمار مشاہدات کیے، پھر جب لوٹے تو دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی اور غسل و وضو کا پانی حرکت میں تھا۔ اس واقعے کی تصدیق یارِ غار نے کی تو صدیق کہلائے، لیکن ابولہب اور ابوجہل کی عقل آڑے آئی اور سب حقائق تشکیک کی دھند میں اوجھل ہو گئے جبکہ عشق نے میدان سر کر لیا کہ بقول اقبالؒ

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

سفرِ معراج کے بارے میں اگر کوئی شخص آج کے دور میں جو سائنسی ارتقاء کا دور ہے۔ یہ دعویٰ کرے کہ میں نے خواب میں زمین و آسماں کی وسعتوں کی سیر کی اور جب میں واپس آیا تو میرا بستر گرم تھا تو کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس دعوے کو تسلیم نہ کرے۔ اگر حضور ﷺ بھی یہ دعویِٰ معراج خواب کے حوالے سے کرتے تو ابوجہل اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کو ماننے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ حالتِ بیداری کی نسبت سے کیا گیا تھا، زمین اور عالم بالا کی سیر بیداری کے عالم میں ہوئی اسی لئے تعقل پرست ذہن اسے ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ جاگتے میں یہ سب کچھ ہو جانا انسانی عقل و فہم سے باہر

کی بات تھی لہٰذا اس معجزہ کو اہلِ ایمان کے لئے آزمائش قرار دیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡيَا الَّتِیۡۤ اَرَيۡنٰكَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ.

(بنی اسرائیل، ۱۷:۶۰)

اور ہم نے تو (شب معراج کے) اس نظارہ کو جو ہم نے آپ کو دکھایا لوگوں کے لئے صرف ایک آزمائش بنایا ہے (ایمان والے مان گئے اور ظاہر بین الجھ گئے)

بعض لوگ رؤیا کے لفظ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سفرِ معراج خواب میں ہوا۔ عربی زمان میں رؤیا رات کے وقت کھلی آنکھوں سے دیکھنے کو بھی کہتے ہیں۔ چونکہ معراج اتنا بڑا سمجھ میں نہ آنے والا واقعہ تھا جو کسی بھی شخص کے لئے عملاً ناممکن تھا۔ اس لئے اسے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قدرتوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا:

سُبۡحٰنَ الَّذِيۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا.

(بنی اسرائیل، ۱۷:۱)

(کہ ہر نقص، عیب اور ناممکن کے لفظ سے) پاک ہے وہ قادرِ مطلق جو لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت سیر کرانے۔

کفار و مشرکین کا ردِعمل بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ معجزۂ معراج کوئی خواب میں پیش آنے والا معمولی واقعہ نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو ان کی طرف سے اتنا شدید ردِعمل سامنے نہ آتا اور نہ ہی قرآن میں اس کا ذکر اس غیر معمولی انداز سے کیا جاتا۔ قاضی عیاض نے ''الشفاء'' میں اپنی تحقیق کے مطابق یہ بیان کیا ہے کہ صحابہ واقعۂ معراج کے جسمانی ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ اسلاف اور مسلمانوں کی اکثریت کا ایمان ہے کہ معراج جسم کے ساتھ بیداری کی حالت میں ہوا اور یہی سچا قول ہے۔

97 اتحادِ اُمت وقت کی اہم ترین ضرورت

سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا.

(آلِ عمران، ۳:۱۰۳)

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو اور اپنے اُوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم (ایک دوسرے کے) دُشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت کے باعث آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

اس آیۂ کریمہ میں آپس میں نفاق ڈالنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے اور مسلمانوں کے آپس میں بھائی بھائی ہونے کو اللہ کی بہت بڑی نعمت کہا گیا ہے۔ سورۃ انعام میں مسلمانوں کو واضح الفاظ میں بتایا گیا کہ وہ ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں جو دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن کی وحدت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ.

(الانعام، ۶:۱۵۹)

بے شک جن لوگوں نے (جدا جدا راہیں نکال کر) اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا اور وہ (مختلف) فرقوں میں بٹ گئے۔ آپ کسی چیز میں ان کے تعلق دار اور ذمہ دار نہیں ہیں۔

ان آیات میں اسلامی معاشرے کے قیام کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اسلامی معاشرے کی کامیابی کی پہلی شرط یہ بیان کی گئی ہے کہ ہر فرد اپنی جگہ اپنی بساط کے مطابق اس ذمہ داری کو ادا کرے، اس بارے میں ارشاد فرمایا گیا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ، ۲:۲۸۶) اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

اس آیت میں جہاں انسانوں پر ان کی استطاعت سے بڑھ کر ذمہ داری نہ ڈالنے کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں بالواسطہ طور پر اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اپنی انفرادی ذمہ داری نہ نبھائے گا تو اللہ کے ہاں روزِ حساب اس کی گرفت ہوگی اور اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔ اگر مسلم معاشرے کے تمام افراد اپنے اندر انفرادی ذمہ داری کا یہ احساس اُجاگر کر لیں تو سمجھو کامیابی کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی ہے۔

اتحادِ اُمت کا خواب اس وقت پورا ہوگا جب اسلامی معاشرے کو صحیح خطوط پر منظّم کر لیا جائے، جس کے لئے ضروری ہے کہ اجتماعیت کا تصور جو مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ اسے حقیقت کے قالب میں ڈھالا جا سکے اس سلسلے میں قرآن وسنت کی تعلیمات اور خود نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہیں۔

ارشادِ خداوندی ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا'' میں وحدت کا تصور اور فلسفہ بیان کیا گیا، اس آیت کے دو حصوں میں پہلا حصہ ''امر'' اور دوسرا حصہ ''نہی'' ہے۔ پہلے حصہ امر میں اتحادِ اُمت کی تعلیم دی گئی ہے، جبکہ ''نہی'' والے حصے میں تفرقہ بازی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن وسنت کے زیادہ تر احکام ''امر'' کی نوعیت کے ہوتے ہیں یا ''نہی'' کی نوعیت کے۔ آج کی قانونی زبان میں ان کو

کرنے والے احکام (Acts of Commission) اور نہ کرنے والے احکام (Acts of Omission) کہا جاتا ہے۔ سورۃ آلِ عمران کی مذکورہ آیت میں مثبت اور منفی دونوں احکام کو اکٹھا کر دیا گیا۔ اس میں اہلِ ایمان سے خطاب کر کے واضح طور پر انہیں آپس میں باہم شیر و شکر ہو کر رہنے اور تفرقہ و انتشار سے ہر حال میں بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ آیت اُخوت و اتحاد کی دعوتِ عام ہے اور اس میں فرقہ پرستی اور تفرقہ پروری کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ دیکھنا کہیں اس لعنت میں گرفتار نہ ہو جانا۔

اتحادِ اُمت جسے اتحاد بین المسلمین بھی کہا جاتا ہے، حقیقی معنوں میں وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسلام دُشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اُمت میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اس کو فروغ دینے کے لئے ایک سات نکاتی فارمولا دیا گیا، جو کتاب ''فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟'' میں شائع کر دیا گیا تھا۔

منہاج القرآن کی صورت میں احیائے اسلام کے مشن کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں احسان ہے کہ تحریک کے اجتماعات میں اہلحدیث، دیوبندی اور شیعہ غرضیکہ تمام مسالک کے افراد شرکت کرتے ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں ہر مکتبِ فکر کے اہلِ نظر اور صائب الرائے حضرات شریک ہوتے ہیں۔

تحریکِ منہاج القرآن احیائے اسلام اور اتحادِ اُمت کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہے۔ اس کا طریقِ کار یہ ہے کہ کوئی بھی اس کی دعوت پر لبیک کہے اور اس کے مشن کے مقاصد سے اتفاق کرے تو اسے تحریک کا دست و بازو بننے کے لئے کہا جاتا ہے۔ بحمد اللہ قائدِ تحریک کی تحریروں اور تقریروں میں ایسے مسائل کو نہیں اُچھالا جاتا، جن کا تعلق اُصولِ دین سے نہیں بلکہ فروعات سے ہو۔ اللہ کے فضل سے تحریک منہاج القرآن کی دعوت اتنی

معتدل اور معقول دعوت ہے کہ جس کے دل میں یہ پیغام اُتر جائے وہ کبھی اس سے بیگانہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارا اُصول یہ ہے کہ ہم کسی مسلک کے اکابرین کے خلاف زبان نہیں کھولتے، یہ الگ بات کہ ہم ان کی پیروی نہ کریں، لیکن اپنے مقام کی وجہ سے وہ ہمارے لئے قابلِ احترام بزرگ ہیں۔

98 نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی راہ میں حائل رکاوٹیں

نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں اور جن کی وجہ سے صحیح اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں نہیں آ رہا، انہیں دور کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ تحریک پوری شدت سے جاری رہے اور وہ انتقال اقتدار کا مرحلہ آجائے جس کے لئے خالص نظریاتی انقلابی طرزِ عمل اپنانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا انقلابی عمل ہی تحریکِ نظام مصطفیٰ ﷺ کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔

اس کے لئے لازم ہے کہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والا طبقہ مکمل نظریاتی خالصیت کی ضمانت مہیا کرے۔ وہ تدبیریں جن سے مطلوبہ نظریاتی خالصیت حاصل کی جاسکتی ہے تین اصولوں کا تقاضا کرتی ہیں۔

☆ صحیح انقلابی کارکنوں کی ہر سطح پر حوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ ہر سطح پر ان عناصر کو دبایا جائے جو دین دشمن ہیں اور معاشرے میں تخریب کاری اور رجعت پسندی کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ ایسی قوتوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔

☆ مفاد پرستوں کو ہر سطح پر بے نقاب کر دیا جائے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کے حامی و مخالف کی طرف سے تین طرح کا ردِ عمل سامنے آیا ہے۔

الف) انقلابیت: جن کے اندر تحریک کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے وہ انقلابی جذبے کے ساتھ تحریک میں شامل ہو جائیں گے۔

ب) رجعت پسندی: وہ عناصر جن کا وجود تحریک کی وجہ سے خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ تحریک کو ناکام بنانے کے لئے ہر قسم کے منفی اور تخریبی ہتھکنڈوں پر اتر آئیں گے۔

ج) مفاد پرستی: تحریک کی اٹھان کے وقت بہت سے لوگ ذاتی مفاد کی آڑ میں تحریک کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ زیادہ دیر نہیں چل سکتے اور بہت جلد وہ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اب جہاں تک تحریک کی کامیابی، ناکامی یا مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کوتاہی کا تعلق ہے اس کا انحصار دو باتوں پر ہوتا ہے۔

۱۔ تحریک کی قیادت کرنے والے ان تین قسموں کے ردِعمل کو جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے اصلی روپ میں پہنچانتے ہیں یا نہیں پہچانتے؟

۲۔ قائدین کا طرزِ عمل ان تین طبقوں کے ساتھ کیسا ہے؟ اور وہ مفاد پرست یا تخریب پسند عناصر کو دبانے کے لئے بروقت مناسب اقدام کرتے ہیں یا نہیں کرتے؟ مزید برآں کیا وہ انقلابی قوتوں کی حوصلہ افزائی اور صحیح سمت میں رہنمائی میں کوتاہی تو نہیں کر رہے؟

اگر قیادت ہر مرحلہ میں اوپر بیان کردہ تینوں طبقوں کی صحیح پہچان اور نشان دہی کر پاتی ہے اور بروقت جرأت اور دانشمندی سے مناسب اقدام کر لیتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تحریک میں شروع ہی سے خالصیت کا رنگ نہ پیدا ہو اور مطلوبہ انقلابی نتائج حاصل نہ کئے جا سکیں۔ اِس کے برعکس جب قیادت کسی مرحلہ پر ان معاملات میں ٹھوکر کھا جاتی ہے تو باوجود اخلاصِ نیت کے منزلِ مقصود کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے قائدین کے لئے یہ پہلو لمحۂ فکریہ کا درجہ رکھتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ان کی ایک پکار پر وہ لاکھوں کارکن جن کے سینے مشین گنوں کے آگے تن گئے تھے

اوران گنت مائیں، بہنیں اور بیٹیاں موت کا سامنا کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئی تھیں اور بوڑھے، نوجوان اور بچے بے سروسامانی کے باوجود میدان میں نکل آئے تھے۔ آج کوئی ان کی بات سننے کے لئے تیار نہیں؟ کیا کوئی ایسا غلط فیصلہ تو نہیں ہوگیا، جس نے قوم کی تقدیر پر رسوائیوں کی سیاہی مل دی ہے؟ آخر اس قوم نے کیا جرم کیا ہے جس کی سزا اسے بھگتنی پڑ رہی ہے؟

اس صورتِ حال کا ازالہ اب بھی ممکن ہے ، اب بھی وقت ہے کہ مختلف قیادتیں انقلابی جرأت و ہمت سے رجعت پسند مفاد پرست عناصر کا صفایا کردیں۔ درج ذیل قرآنی آیات انہیں دعوتِ غوروفکر دیتی ہیں۔

۱. وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

(الانفال،۸:۳۹)

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ باطل طاغوتی فتنہ ختم ہو جائے اور دین (ملکی نظام) کلی طور پر اللہ کے لئے ہو جائے۔

۲. وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا

(النساء،۴:۷۵)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ راہ خدا میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کمزور ناتواں مرد، عورتیں اور بچے (پکار پکار) کر کہتے ہیں کہ اے رب العزت! ہمیں اس بستی سے نکال لے جہاں کے باشندے جابرو ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی قدرت سے کوئی دوست اور ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی مددگار کھڑا کردے۔

99 سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۱)

پاکستان کا قیام اسلام کے عملی نفاذ کے مطالبے کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے ہر دور میں یہ مطالبہ لوگوں کے دلوں کی آواز بنا رہا، کیونکہ قیامِ پاکستان کے مقاصد صرف اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ ہم دنیا کے سامنے یہ بات ثابت کر سکیں کہ اسلام ایک قابلِ عمل دین ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں چند تجاویز قوم کے سامنے رکھی گئی تھیں، جن میں بہرحال کمی بیشی کی گنجائش موجود ہے وہ تجاویز حسبِ ضرورت ترمیم اور اضافے کے بعد اپنے اندر قومی سوچ رکھنے والے احباب کے لئے غور و خوض کا سامان رکھتی ہیں۔ اس وقت جو سیاسی مسئلہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اس کے اہم پہلو یہ ہیں:

۱۔ سیاسی جماعتوں کا جواز

۲۔ انتخابات کا تصور اور طریقِ کار

۳۔ انتخابات میں ووٹر اور امیدوار کی شرائطِ اہلیت

۴۔ نظامِ حکومت کی تشکیل

ہم ان پہلوؤں پر مختصراً ضروری بات کریں گے۔

۱۔ اسلامی ریاست میں اسلام نے جماعتیں بنانے کی اجازت دی ہے، لیکن ان کی غرض و غایت، مقاصد اور دائرہ کار متعین کر دیا گیا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم نے اس طرح کیا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ   اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور

اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْ ءٍ فَرُدُّوْہٗ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ۔

(صحیح البخاری ۲:۱۰۷۸ کتاب الاخبار الاحاد رقم حدیث: ۶۸۳۰)

رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (اہلِ حق) صاحبانِ امر کی، پھر اگر کسی مسئلہ میں تم باہم اختلاف کرو تو اسے (حتمی فیصلہ کے لئے) اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو۔

اس ارشادِ خداوندی میں یہ حقیقت وضاحت سے بیان کردی گئی ہے کہ اسلامی ریاست میں محکوم طبقہ صرف اس وقت تک حکمرانوں کے احکام کا پابند ہے جب تک وہ خدا اور رسول اللہ ﷺ کے تابع رہیں اور ان کا عمل کتاب وسنت کے ضابطوں کے مطابق ہو۔ اگر صورت حال اس کے الٹ ہو جائے تو عوام کو اجازت ہے کہ وہ ان کی اطاعت سے انکار کردیں کیونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے

لَا طَاعَۃَ فِیْ مَعْصِیَۃِ اللّٰہِ، اِنَّمَا الطَّاعَۃُ فِی الْمَعْرُوْفِ۔

(صحیح البخاری ۲:۱۰۷۸ کتاب الاخبار الاحاد رقم حدیث: ۶۸۳۰)

خدا کی معصیت اور نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت کی قطعاً اجازت نہیں، اطاعت صرف درست اور نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے۔

اسی طرح سیدنا فاروقِ اعظمؓ کا یہ ارشاد بھی توجہ طلب ہے۔

من دعا الی امارۃ نفسہ او غیرہ من غیر مشورۃ من المسلمین فلا یحل لکم ان لا تقتلوہ۔

(کنز العمال، ۵:۷۷۸، رقم حدیث: ۱۴۳۵۹)

جو حکمران مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر اپنی یا کسی اور کی آمریت کی دعوت دے تو تم پر آرام سے بیٹھے رہنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک تم اس کا خاتمہ نہ کردو

اس طرح صدیق اکبرؓ کا پہلا خطبہ جو آپ نے خلافت سنبھالتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ایھا الناس، فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم، فان احسنت فاعینونی و ان اسات فقوّمونی...... و اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ، فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔

(کنزالعمال، ۵:۶۰۱، رقم حدیث: ۱۴۰۶۴)

اے لوگو مجھے تم پر حکمران مقرر کر دیا گیا ہے حالانکہ میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں پس اگر میں اچھائی کی راہ پر چلوں تو میری مدد کرنا اور اگر برائی کی راہ پر چلوں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دینا۔ تم میری اس وقت تک اطاعت کرتے رہنا جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا رہوں۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا نافرمان ہو جاؤں تو تم پر میرے فرمان کی اطاعت قطعاً واجب نہیں۔

یہ خطبہ ہمارے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم پارلیمانی جمہوری نظام سے اُبھرنے والی قیادت کو ان رہنما اُصولوں کی رُوشنی میں پرکھ سکتے ہیں، جو خلفائے راشدین نے قائم کئے تھے فی الحقیقت اسلام کی رُوحِ شورائیت، جمہوریت کی بنیاد ہے جس کو زندہ رکھنے کے لئے انہوں نے لائقِ تقلید مثالیں چھوڑیں، جو تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

100 سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۲)

حضور ﷺ کے وصال کے بعد انصارِ مدینہ ایک سیاسی مؤقف پر جمع ہو گئے تھے جبکہ مہاجرین کا مؤقف دوسرا تھا۔ دونوں طرف جلیل القدر صحابہ موجود تھے۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں سربراہِ مملکت کے چناؤ کے لئے دونوں نے جدا جدا امیدوار نامزد کر دیئے تھے اور ان پر جمہوری انداز میں طویل بحث بھی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں انصار نے اپنا امیدوار واپس لے لیا اور بالاخر سیدنا صدیق اکبرؓ کو خلیفہ بنانے پر اتفاق ہو گیا۔ اس تاریخی حقیقت سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ میں قیام حکومت کے مسئلہ پر دو مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے طبقے پائے جاتے تھے۔ بلکہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ دو سربراہوں کے انتخابات کی تجویز بھی پیش کی گئی تھی۔ مگر اسے ملی وحدت کے منافی تصور کرتے ہوئے قبول نہ کیا گیا۔ روایات سے ایک تیسرے طبقے کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے جو حضرت علیؓ کو خلافت کا مستحق سمجھتے ہوئے انہیں اپنا امیدوار بنانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اسے نامناسب سمجھتے ہوئے قبول نہ کیا۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ صحابہ کرامؓ میں مختلف سیاسی نظریات والے لوگ موجود تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں تو کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آ چکی تھیں جن میں ایک اپنے آپ کو شیعانِ علیؓ کہتے تھے جبکہ دوسری جماعت خارجیوں کی تھی۔ اس سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام میں حکومت کے قیام کے لئے سیاسی جماعت بنانے پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ مگر فتنہ پردازوں کے خلاف عمر بھر جنگیں لڑی گئیں اور یہ جنگیں اس وقت تک لڑی گئیں جب تک ان کا خاتمہ نہ ہو

گیا۔

قرآن حکیم نے نیکی کے فروغ اور ہر طرح کی بدی کے خاتمے کے لئے اجتماعی جدوجہد کو مسلمانوں کی ذمہ داری قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں کہیں نہیں کہا گیا کہ اس مقصد کے لئے ایک سے زیادہ جماعتیں قائم کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

۲۔ اسلام نے اقتدار قائم کرنے اور حکومت بنانے کے لئے انتخابات ہی کا طریقہ تجویز کیا ہے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ اور شوریٰ کی آیت نمبر ۳۸ میں قرآنی حکمِ مشاورت اس مقصد کی تکمیل میں مددگار اور معاون بنتا ہے۔ طریقِ کار اور ضروری تفصیلات طے کرنے کا کام ہر دور اور ہر ریاست کے مخصوص سیاسی حالات کے مطابق اجماعِ امت پر چھوڑ دیا گیا۔ ان امور کا تعین حکومتِ وقت کے رہنما' سیاسی قائدین اور مفکرین باہمی مشاورت اور سوچ بچار سے کر سکتے ہیں۔

۳۔ انتخابات کے لئے ووٹر اور امیدوار کی شرائط کا مسئلہ انتہائی اہم اور غور طلب ہے۔ اسلامی نظام میں تمام عہدے اور ذمہ داریاں امانت کا درجہ رکھتی ہیں اور امانت کے بارے میں قرآن حکیم کا اصولی حکم یہ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا۔	بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں۔
	(النساء ۴:۵۸)

قرآن حکیم نے اس سلسلے میں کم از کم چھ (۶) شرائط کا ذکر کیا ہے جن میں ایمان' عملِ صالح' معیارِ علم' شخصی وجاہت' حکمت و دانائی اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت اور قدرت اپنی جگہ اہم ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ قوم ایسے نمائندے منتخب کرے جو صحیح معنوں میں حقِ نمائندگی ادا کر سکیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو جمہوریت کی بجائے آمریت قائم ہو جائے گی۔

احادیثِ نبوی اور فقہ اسلامی کی روشنی میں شرائطِ اہلیت کا معیار عام ارکانِ پارلیمان سے لے کر سربراہِ مملکت تک متعین کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ طرزِ انتخابات کی طرح نظامِ حکومت کا مسئلہ بھی اجماعِ امت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسلام کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ پارلیمانی طرز کا نظام نافذ کریں یا صدارتی طرز کا۔ اگر نظام حکومت اسلام کی تجویز کردہ مشاورت کی روح کے مطابق ہو تو وہ اسلامی ہے ورنہ غیر اسلامی خواہ اقتدار کی باگ ڈور مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں ہی کیوں نہ ہو۔

اس ضمن میں چند پیش کردہ تجاویز قابلِ غور ہیں کہ انتخابات اور حکومت سازی کے عمل میں صرف وہی افراد اور جماعتیں حصہ لیں جو واضح طور پر اسلام کے نفاذ کا پروگرام رکھتی ہوں اور جو اسلام کو بطور نظامِ حیات نافذ کرنے پر یقین نہیں رکھتے انہیں انتخابی عمل میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، نیز امیدواروں کی اہلیت کی جانچ پڑتال اور انتخابی مہم کے انتظامات حکومت کا غیر جانبدار ادارہ سرکاری سطح پر کرے۔ امیدواروں کو چناؤ کے دن ووٹروں کو پولنگ سٹیشن تک لے جانے کی اجازت نہ دی جائے اور جو کوئی عوام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے تو اسے نا اہل قرار دے کر انتخابی عمل سے باہر کر دیا جائے۔

101 معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا کا ہر نظامِ معیشت دراصل ملکیت کے تصور ہی پر قائم ہے۔ تصورِ ملکیت سے اس کے بنیادی اصول اور تفصیلات کا تعین کیا جاتا ہے۔ جن پر اس بات کا انحصار ہوتا ہے کہ وہ نظامِ معیشت کہاں تک نتیجہ خیز اور مؤثر طور پر قابلِ نفاذ ہے؟ اس بناء پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تصورِ ملکیت ہی کسی نظام معیشت میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کی دنیا میں بالعموم معیشت کے دو نظام رائج ہیں جنہیں سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام معیشت کہا جاتا ہے۔ ان دونوں نظاموں کے فلسفے پر غور کیا جائے تو ان کی اصل ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں انفرادی ملکیت کو بے لگام کھلا چھوڑ دیا گیا ہے جبکہ دوسرے میں اجتماعی ملکیت کی ضمانت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب جہاں تک ملکیت کا تعلق ہے اس سے جو حقوق، واجبات اور قانونی اثرات جنم لیتے ہیں وہ دونوں نظاموں میں یکساں ہیں۔ ان کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اپنے مزاج اور خصوصیت کے اعتبار سے یہ تصورِ ملکیت خودغرضی اور مفاد پرستی کے رجحان کے تابع ہے۔ اس تصورِ ملکیت سے جو بھی نظامِ معیشت وضع کیا جائے گا اس کا لازمی نتیجہ انفرادی اور اجتماعی حقوق میں ٹکراؤ کی صورت میں نمودار ہوگا جس سے مختلف طبقوں اور گروہوں میں نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑکے گی اور ملکی پیداوار بھی بہر حال متاثر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حقوق اور مفادات کے درمیان جو تصادم کی صورتِ حال نظر آرہی ہے اس کو دونوں نظاموں میں سے کوئی بھی آج تک دور نہیں کر سکا اور حقیقت

بھی یہی ہے کہ وہ نظامِ معیشت جس کی بنیاد خودغرضانہ تصورِ ملکیت پر رکھی گئی ہو اس رجحان کو ختم کرنے کی صلاحیت اور قدرت نہیں رکھتا۔

ان دو نظاموں کے مقابلے میں پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جو نظامِ معیشت بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے وہ ایسے عظیم انقلابی تصورات، عملی ضابطوں اور اصولوں پر وجود میں لایا گیا ہے جس سے بہتر کوئی تصور، فکر یا فلسفہ معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ آپ ﷺ کا عطا کیا ہوا نظام ہر اعتبار سے مکمل اور مثالی ہے۔ کوئی انسانی عقل کا بنایا ہوا نظام نہ ہی ارتقائی طور پر اس کا مقابلہ کر سکتا ہے نہ ہی اس سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس سلسلے میں جو انقلابی تصورِ ملکیت دیا ہے اس نے اسلامی نظامِ معیشت کو ان تمام خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ رجحانات سے پاک کر دیا ہے جو آج اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

باری تعالیٰ نے ہر شئے کی تخلیق کا مقصد خلقِ خدا کو فائدہ پہنچانا قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا	وہی ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں ہے تمہارے فائدے کے لئے تخلیق کیا۔

(بقرہ، ۲:۲۹)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ط قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ. (اعراف، ۷:۱۰)	بیشک ہم نے تمہیں زمین میں تمکن عطا کیا اور اس میں تمہارے اسباب زندگی پیدا کئے پھر بھی تم بہت کم شکر کرنے والے ہو۔

یہی سبب ہے کہ اسلام نے مردہ اور بے آباد زمینوں پر ان کے آباد کرنے والے کا حقِ ملکیت مانا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

من اعمرا رضاً لیست لاحد فھو احق، قال عروۃ قضیٰ بہ عمر فی خلافتہ	جس نے ایسی زمین آباد کی جو کسی کی ملکیت نہیں وہی اس کا زیادہ حقدار ہے، عروہ کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں یہی فیصلہ کیا تھا۔
(صحیح البخاری، ۱: ۳۱۴ کتاب الحرث والمزارعۃ رقم حدیث: ۲۲۱۰)	

قرآن وسنت نے دوسروں کو اپنے ملکیتی اموال کے منافع میں شریک کرنا ان کا شرعی حق قرار دیا ہے نہ کہ محض کوئی نفلی نیکی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.	اور ان کے احوال میں ضرورت مندوں اور معیشت سے محروم لوگوں کا حق ہے۔
(صحیح البخاری، ۱: ۳۱۴ کتاب الحرث والمزارعۃ رقم حدیث: ۲۲۱۰)	

اس حق کے دینے میں قرآن حکیم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان سے اس حق کی شرعی اور قانونی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی ۲۶ ویں آیت سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

102 قرآنی فلسفۂ انقلاب اور دعوت (۱)

جب ہم انقلاب کے حوالے سے قرآنِ حکیم اور سنتِ طیبہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انقلابی جدوجہد کا سب سے پہلا مرحلہ دعوت ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ آج ہماری زندگی میں دینی اور مذہبی کاموں میں دعوت کا کام رک گیا ہے۔ جمود اور ٹھہراؤ کی کیفیت میں آج صورتِ حال یہ ہے کہ انقلاب کی راہ پر پہلا قدم اٹھانا بھی محال ہوگیا ہے۔ دین پر کام کرنے والے طبقے علم اور عمل کے میدان میں تو محنت کر رہے ہیں مگر دعوت پر وہ محنت نہیں ہو رہی جو ہونی چاہئے تھی۔ یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہئے کہ انقلابی اور جہادی عمل صرف وعظ و نصیحت، درس و تدریس یا تصنیف و تالیف سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سارا عمل مختلف مراحل میں دعوت کے بنیادی کام میں انقلاب کے لئے سازگار تو ہوتا ہے، انقلاب لانے کا ذریعہ نہیں بنتا۔ تعلیم سے نظریات اور عقائد تو درست ہو سکتے ہیں اور فہمِ دین بھی واضح ہو سکے گا مگر یہ سب کچھ انقلاب کی بنیاد نہیں بن سکے گا اس لئے کہ یہ عملِ دعوت ہی ہے جس سے انقلاب کی نتیجہ خیزی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر کُل اجزاء سے مل کر بنتا ہے، اسی طرح یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ جو خاصیتیں متفرق طور پر اجزاء میں پائی جاتی ہیں وہ کل میں جمع ہو کر ایک وحدت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کائنات میں فطرت کے عطا کردہ اصولِ وحدت کی کڑی میں اس طرح پروئے ہوئے ہیں کہ کسی بھی ماحول اور معاشرے کے اندر ان میں ذرہ

بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

تَبۡدِيۡلًاۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا (۳۵:۴۳)	اور اللہ کے دستور میں آپ کوئی تغیر و تبدل نہ پائیں گے۔

دعوت اس لئے اہم ہے کہ یہ عملِ انقلاب کی بنیاد ہے۔ قرآنی فلسفۂ انقلاب میں دعوت کو وہی بنیادی اہمیت حاصل ہے جو کسی درخت کو تناور بنانے میں بیج کی ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے آج ہم نے دعوت کے سلسلے میں عملاً انحراف کا رویہ اپنا رکھا ہے جس کی وجہ سے ہمارا نظام ہر پہلو سے زوال اور انحطاط کا شکار ہوتا چلا آ رہا ہے۔

قرآن مجید نے فرد اور قوم کی زندگی و موت کے مراحل کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے

وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَحۡيَاكُمۡ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَكَفُوۡرٌ (۲۲:۶۶)	اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی بخشی پھر تم کو موت دے گا پھر تم کو (قیامت کے دن) زندہ کرے گا بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے (کہ اللہ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا)۔

یہ سارا نظامِ فطرت بنیادی طور پر اس وحدانی اصول پر قائم ہے جس کے تحت ربِّ کائنات مردہ قوموں کو پست حالت سے نکال کر انقلاب سے آشنا کرتا ہے۔ سورۃ مریم میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی ضمیر میں نشوونما کے سب تقاضے رکھے گئے ہیں۔ ہاں جب کوئی قوم ان سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے اور اس پر جمود اور بے حسی طاری ہو جاتی ہے تو اس پر زوال کے سایے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار وہ مرحلہ

آ جاتا ہے جس میں وہ اجتماعی موت میں مبتلا کر دی جاتی ہے۔ اگر ایسے میں نظامِ دعوت کے ذریعے زندگی بخش قوتوں کو بروئے کار لایا جائے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو پھر زندہ کر دے گا۔ اس آیت میں یہ نکتہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ قوم کی زندگی میں نشوونما کی صلاحیت روزِ ازل سے رکھ دی گئی ہے۔ جس سے اسے زندگی عطا کر دی جاتی ہے، پھر موت وحیات کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جس کی بنیاد امرِ دعوت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر استوار ہے۔ سلسلۂ موت وحیات اور امرِ دعوت کے اس مضمون کو قرآنِ حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ هُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡیَاهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ○

(۲۴۳:۲)

(اے حبیب ﷺ!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل گئے حالانکہ وہ ہزاروں (کی تعداد میں) تھے تو اللہ نے انہیں حکم دیا مر جاؤ (سو وہ مر گئے) پھر انہیں زندہ فرما دیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ (اس کا) شکر ادا نہیں کرتے۔

اس سلسلے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ قوم جو موت سے ڈر جاتی ہے اس پر موت طاری کر دی جاتی ہے اور جو موت سے ٹکرا جائے اس کے لئے حیات لکھ دی جاتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگ جب موت سے فرار کی راہ اختیار کرنے لگے تو انہوں نے بزدلی کو اپنی زندگی کا وطیرہ بنا لیا۔ یہ طرزِ عمل سراسر دعوت کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ سو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی اور پھر جب انہوں نے بزدلی کے طرزِ عمل کو ترک کر دیا تو انہیں نئے سرے سے زندگی عطا کر دی گئی۔ اس لئے زندہ قوموں کی طرح رہنے کا

شیوہ موت سے ڈرنا نہیں بلکہ موت سے لڑنا ہے۔فلسفۂ انقلاب میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جہاد اور انقلاب کے بغیر باعزت زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔لہذا زندہ رہنا ہے تو مرنا سیکھو، ورنہ بزدلی کی زندگی کا انجام رسوا کن موت کے سوا اور کچھ نہیں۔اقبالؒ نے زندگی اور موت کا فلسفہ اپنے اس شعر میں کیا خوب بیان کیا ہے۔

ہے صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

وہ قوم جس کے دل سے موت کا خوف نکل جاتا ہے آبرومندانہ طریقے سے زندہ رہتی ہے اور جہادِ زندگی میں کامیابی وکامرانی اس کا مقدر کر دی جاتی ہے۔

103 قرآنی فلسفۂ انقلاب اور دعوت (۲)

قرآنی فلسفۂ انقلاب میں انقلاب کے حوالے سے جب قرآنِ حکیم اور سنتِ طیبہ سے رہنمائی حاصل کی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انقلابی جدوجہد کا سب سے پہلا مرحلہ دعوت ہے کہ اس کے بغیر انقلاب ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے انقلابی جدوجہد میں دعوت کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہماری دینی زندگی جمود اور بے عملی کا شکار ہے۔ جس کا بڑا سبب دعوت کے کام کا رک جانا ہے۔ اس کے نتیجے میں آج دینی جدوجہد کے میدان میں علم و عمل پر تو بہت زور دیا جاتا ہے مگر ان دونوں شعبوں میں دعوت پر وہ محنت نہیں کی جاتی جو ہونی چاہیے تھی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تحریکی، انقلابی اور جہادی کاوشیں صرف تعلیم، تدریس، تصنیف و تالیف اور عمل و ریاضت سے بارآور اور نتیجہ خیز نہیں ہوتیں۔ یہ سارے امور انقلابی جدوجہد کے مختلف مراحل میں مددگار تو ثابت ہو سکتے ہیں مگر ذریعۂ انقلاب نہیں بن سکتے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ انقلاب کی بنیادِ عمل دعوت ہے۔

قرآن حکیم نے موت و حیات کا جو فلسفہ بیان کیا ہے اس کا مرکزی نقط یہ ہے کہ وہ قومیں جو اجتماعی طور پر دعوت کے کام کو چھوڑ دیتی ہیں ان کو تباہی اور ہلاکت سے دوچار کر دیا جاتا ہے اور دعوت کے کام کو ازسرِ نو جاری کرنے سے انہیں دوبارہ زندگی عطا کر دی جاتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کون سی دعوت ہے جس کی بدولت موت حیات سے بدل دی جاتی ہے اور جو قوموں کو طویل مدت تک زندہ رکھتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

موت و حیات کے سلسلے میں قرآن نے ایک اُصول بیان کیا ہے جو فرد اور قوم دونوں پر صادق آتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌO (۲۲:۶۶)

اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی بخشی پھر تم کو موت دے گا پھر تم کو (قیامت کے دن) زندہ کرے گا، بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے (کہ اللہ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا)۔

اس آیۂ کریمہ میں افراد کی زندگی و موت کے جن مراحل کو بیان کیا گیا ہے اس کی بنیاد اصولِ وحدت پر رکھی گئی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ربّ خبیر و بصیر ہی مردہ قوموں کو ان کی اس حالت سے جو پستی اور مردنی کی علامت ہیں نکال کر ایک طرح کی نئی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے پہلے مردہ قوم کو انقلاب کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ آیت میں ''اَحْيَاكُمْ'' کے الفاظ اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسانی زندگی کی اس چیز میں جسے ضمیر کہتے ہیں ایسے تقاضے رکھے گئے ہیں جن کو اگر پورا کیا جائے تو انسان حیات بخش قوتوں کا مالک بن جاتا ہے اور اگر انہیں پورا کرنا چھوڑ دے تو اجتماعی طور پر اس قوم کی یہ قوتیں ماند پڑ جاتی ہیں اور وہ قوم مردہ کر دی جاتی ہے۔ آیتِ مذکورہ ''يُمِيْتُكُمْ'' کا اشارہ اسی طرف ہے۔ اس بناء پر جب عملِ دعوت اپنی پوری توانائی کے ساتھ معاشرے میں برپا ہوتا ہے تو وہ قوم زندہ کر دی جاتی ہے۔ قرآن کے فرمان کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور قوموں کی زندگی میں یہ اصول قائم کر کے ان میں ارتقاء اور نشو و نما کی تمام صلاحیتیں رکھ دی ہیں اور انہیں زندہ امور کا نہ صرف مالک و مختار بنایا ہے بلکہ ان کے وجود کو سراپا زندگی بنا دیا۔ اس طرح اس قادرِ مطلق ذات نے موت و حیات کا ایک ایسا

سلسلہ قائم کردیا جس کی بنیاد امرِ دعوت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر ہے۔

دعوت کے باب میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ موت سے ڈر جانے والی قوم پر موت مسلط کردی جاتی ہے اور جو موت کے خوف سے بے نیاز ہو جائے وہ حیات پا جاتی ہے۔ گویا موت کے خوف سے پست ہمتی اور بزدلی دکھانے والی قوم کا مقدر موت کردی جاتی ہے اور موت سے ٹکرا جانے والوں کا مقدر زندگی بنا دیا جاتا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۴۳ میں قوم بنی اسرائیل کے احوال کا ذکر ہے جس سے یہی بنیادی سبق حاصل ہوتا ہے کہ جہاد اور انقلاب کے بغیر باعزت زندگی کا کوئی تصور نہیں۔

نظامِ دعوت کو کامیاب کرنے کے لئے دو شرائط (۱) جان کی بازی اور (۲) مال کی قربانی ہیں، ان پر پورا اُتر کر ہی انقلابی جدوجہد کو نتیجہ خیز بنایا جاسکتا ہے۔ قرآن میں اس مضمون کو بنی اسرائیل کے حوالے سے یوں بیان کیا گیا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْآ ... عَلِيْمٌ○ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ○

(۲:۲۴۴۔۲۴۵)

(اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔ کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے پھر وہ اس کے لئے اسے کئی گنا بڑھا دے گا اور اللہ ہی (تمہارے رزق میں) تنگی اور کشادگی کرتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

104 فرقہ پرستی کا مسئلہ اور اُس کا حل

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(آل عمران،۳: ۱۰۲-۱۰۳)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرا کرو، جیسے اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہاری موت صرف اُسی حال پر آئے کہ تم مسلمان ہو اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو اور اپنے اُوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو، جب تم (ایک دوسرے کے) دُشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت کے باعث آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، اور تم (دوزخ کی) آگ کے گڑھے کے کنارے پر (پہنچ چکے) تھے، پھر اس نے تمہیں اس گڑھے سے بچا لیا، یوں ہی اللہ تمہارے لئے اپنی نشانیاں کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

اُوپر دی گئی آیات میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے

جہاں انہیں تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے، وہاں اللہ کی رسی یعنی دین کو مضبوطی سے تھام کر باہمی اتحاد و اتفاق اختیار کرنے اور تفرقہ و انتشار سے بچنے کی تاکید بھی کی ہے۔ ان ارشاداتِ الٰہیہ کی رو سے مسلمانوں پر ایک فعال معاشرے کے قیام کے لئے دو قسم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے: ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔

انفرادی ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان اصلاحِ حال کا آغاز اپنی ذات سے کرے، وہ سب سے پہلے اپنی اخلاقی زندگی کو سنوارے اور دوسروں سے اصلاح کی توقع میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے۔ ہماری ایک سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اپنی انفرادی ذمہ داری نبھانے کی بجائے دوسروں پر تنقید کرتے رہتے ہیں، جس سے کسی سطح پر اصلاحِ احوال کا آغاز نہیں ہو پاتا اور معاملات میں سنورنے کی بجائے اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلامی معاشرے کو منظّم کرنے کی اجتماعی ذمہ داری تمام اُمتِ مسلمہ پر ڈالی گئی ہے۔ اجتماعیت کا تصورِ اسلام کی فطرت میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ حقوق اللہ ہو یا حقوق العباد، ہر جگہ اس کا رنگ نظر آتا ہے۔ اسلام کو زمانے کی ہلاکت خیزیوں سے جو فرقہ پرستی کی صورت میں بہت بڑے خطرے کا باعث ہیں، محفوظ رکھنے کے لئے قرآنی تعلیمات اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت پاک ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس سلسلے میں جس ضابطۂ عمل کو اپنانے کی اشد ضرورت ہے، وہ قرآن وسنت کے تصورِ اجتماعیت کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔

مذکورہ آیت ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا'' میں اُمت کو جو تصورِ وحدت دیا گیا ہے وہ دو حصوں پر مشتمل ہے، اور اس میں بیک وقت مثبت اور منفی دونوں احکام کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو حکم دے رہا ہے کہ تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ یہ تو تھا مثبت حکم۔ اس کے بعد امتناعی حکم ہے کہ خبردار کہیں تم

تفرقہ اور انتشار کا شکار نہ ہو جانا۔ اس میں واضح طور پر فرقہ پرستی اور تفرقہ بازی کی مذمت کی گئی ہے اور بڑی وضاحت سے امتِ واحدہ کا یہ تصور دل و دماغ میں بٹھایا گیا ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد ہی نسل و رنگ، زبان، قبیلہ پر مبنی عصبتوں کے بت توڑ کر تمام انسانوں کو دائمی وحدت کے رشتے میں پرو دینا ہے۔

حضور ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارکہ میں اہلِ ایمان سے ارشاد فرمایا:

''مسلمانوں کی باہمی محبت اور ایک دوسرے کے لئے رحمت ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے وہ ایک جسم ہوں، جس میں ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم بے خواب اور بے آرام ہو جاتا ہے۔ (صحیح المسلم، ۲: ۳۲۱ کتاب البر والصلہ رقم حدیث: ۲۵۸۶)

آنحضور ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق تمام اُمتِ مسلمہ ایک جسم کی مانند ہے، جبکہ تمام افرادِ اُمت اس کے اعضاء ہیں۔ جس کے ایک عضو کو بھی تکلیف پہنچے تو باقی سارے اعضاء آرام اور سکون سے نہیں رہ سکتے۔ اجتماعی درد کا یہ رشتہ اس طرح ہے کہ جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہو تو اس کے لئے روتی آنکھ ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

یہی رشتہ ایک مسلمان کا ملتِ اسلامیہ سے ہونا چاہیے۔

فرقہ پرستی وہ قاتل زہر ہے جو ملت کے جسم میں سرایت کرتا ہے تو اس کی اجتماعی قوت پارہ پارہ ہو جاتی ہے، اس میں ایسا انتشار پیدا ہوتا ہے، جس پر اگر قابو نہ پایا جائے تو ملت کی اجتماعی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسے فرقہ بندی اور تفرقہ پروری کی زندگی ایسی موت کی طرف لے جاتی ہے، جو قرآن کی اصطلاح میں حالتِ کفر کی موت ہے۔ اس فلسفے کی وضاحت حضور ﷺ کے ایک ارشاد سے ہو جاتی ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''

جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے یعنی اجتماعی وحدت کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوتی ہے اور جو کوئی جماعت سے جُدا ہوگا وہ دوزخ کی آگ کا لقمہ بن جائے گا۔

اُمتِ مسلمہ کی کتنی بدقسمتی ہے کہ وہ مختلف فرقوں اور طبقوں میں بٹ کر اپنے مسلک اور فرقے کے تحفظ کو اسلام کی سلامتی قرار دے رہی ہے۔ وہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ اگر خدانخواستہ دُشمن کے ہاتھ اسلام کے دامن تک پہنچ گئے تو تمہارے مسلکوں اور فرقہ بندیوں کو کون سلامتی کی ضمانت دے گا؟ عاقبت اور سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوکر باہمی انتشار و تفرقہ سے بچیں۔ قرآن نے باہمی تکرار و تنازع اور جھگڑے کھڑے کرنے کو یہودیوں کا شیوہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اہلِ اسلام کو چاہیے کہ وہ تاریخ سے سبق حاصل کریں، ورنہ اقوامِ عالم کی نظر میں ان کا وقار اور رُعب و دبدبہ ختم ہو جائے گا اور اُن کی حالت وہ ہو جائے گی جس کی طرف قرآن حکیم نے انہیں متوجہ کیا ہے۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔	اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ (متفرق اور کمزور ہوکر) بزدل ہو جاؤ گے اور (دُشمنوں کے سامنے) تمہاری ہوا (یعنی قوت) اُکھڑ جائے گی۔ (الانفال، ۸:۴۶)

ماخذ کتب

منتخب دروس پر مبنی تالیف ''تعلیماتِ اسلام'' کو ترتیب دیتے وقت قبلہ قائدِ انقلاب **پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری** کی درج ذیل کتب سے مدد لی گئی۔

۱۔ عقیدۂ شفاعت

۲۔ عقیدۂ توسل

۳۔ قرآن اور شمائلِ نبوی

۴۔ تصورِ بدعت اور اس کی شرعی حیثیت

۵۔ حقیقتِ تصوف

۶۔ ایمان بالرسالت

۷۔ قرآنی فلسفۂ انقلاب

۸۔ عقیدۂ علم غیب

۹۔ جشنِ عیدِ میلاد النبی کی شرعی حیثیت

۱۰۔ ایصالِ ثواب اور اس کی شرعی حیثیت

۱۱۔ ایمان بالرسالت

۱۲۔ فسادِ قلب اور اس کا علاج

۱۳۔ اسلامی فلسفۂ زندگی

۱۴۔ معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

۱۵۔ سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

۱۶۔ ایمان اور اسلام

۱۷۔ ایمان بالآخرت

۱۸۔ عقیدۂ ختم نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی

۱۹۔ مومن کون ہے؟

۲۰۔ معارفِ اسم محمد

۲۱۔ سیرت و فضائل نبوی ﷺ

۲۲۔ عقیدۂ توحید اور حقیقتِ شرک

۲۲۔ ارکان ایمان

۲۳۔ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟

۲۴۔ اسلامی تربیتی نصاب

۲۵۔ نظامِ مصطفیٰ ﷺ (ایک انقلاب آفریں پیغام)

۲۶۔ حقیقتِ جہاد

۲۷۔ جہاد بالمال